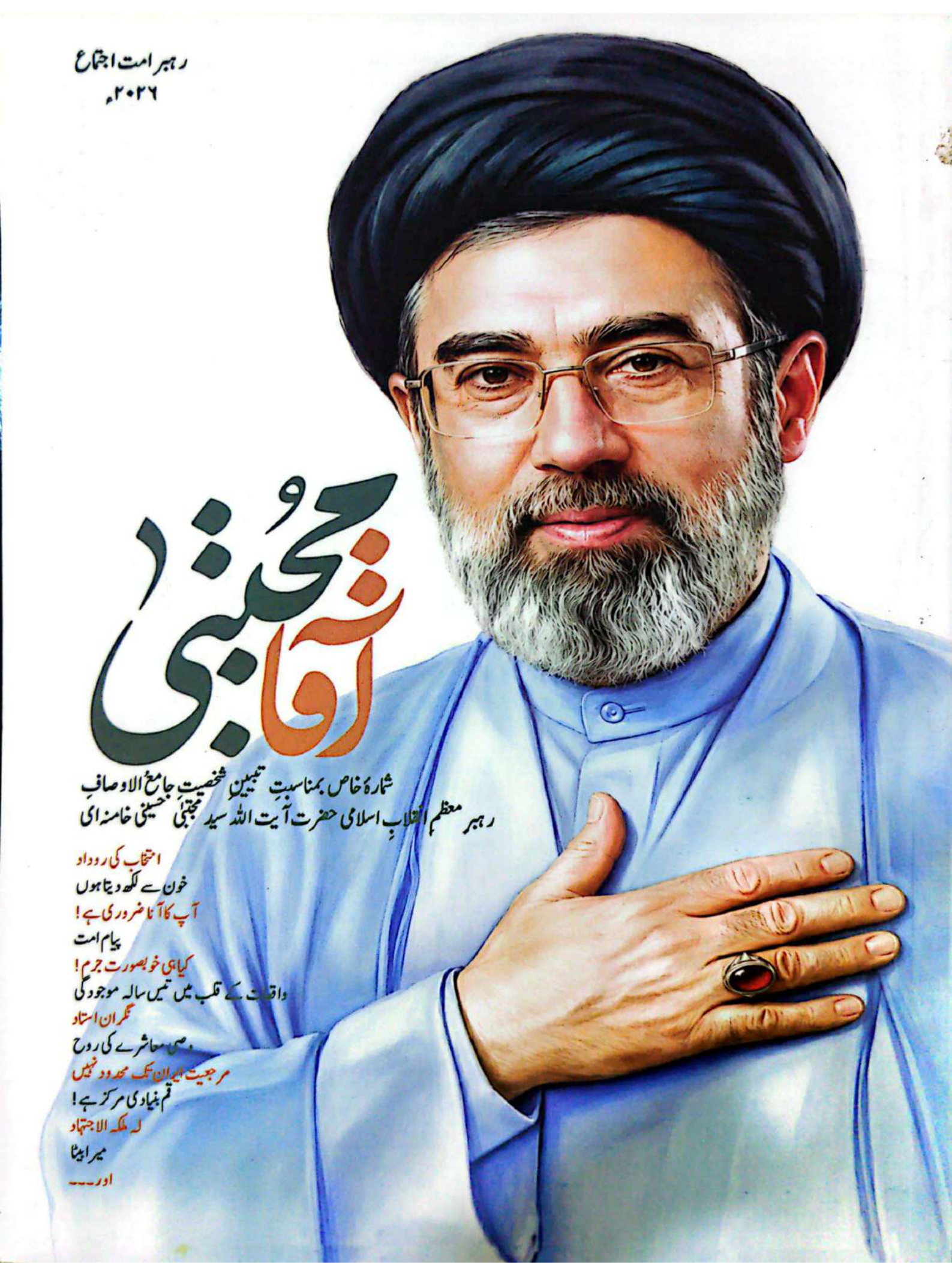
رہبر امت اجتماع
۲۰۲۶ء



آقا خمینی

شمارۂ خاص بمناسبتِ تبیینِ شخصیتِ جامع الاوصافِ
رہبر معظم انقلابِ اسلامی حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای

انتخاب کی روداد
خون سے لکھ دیتا ہوں
آپ کا آنا ضروری ہے!
پیام امت
کیا ہی خوبصورت جرم!
واقعات کے قلب میں تیس سالہ موجودگی
نگران استاد
صحی معاشرے کی روح
مرجعیت ایران تک محدود نہیں
قم بنیادی مرکز ہے!
لہ ملکہ الاجتہاد
میرا بیٹا
اور۔۔۔

CamScanner


بسم الله الرحمن الرحيم

CamScanner

تعارف

کتاب:	آقا مجتبیٰ (نشریہ خط کا ترجمہ)
ترتیب و تالیف:	خانہ طلاب جوان قم
ترجمہ:	سیدہ مریم ہمدانی/سیدہ معصومہ ہمدانی
نظارت و تصحیح:	سید علی جواد ہمدانی
تزئین و آرائش و صفحہ بندی:	عباس ثاقب
طراحی جلد:	سیدہ فاطمہ ہمدانی
سال طبع:	ستمبر ۲۰۲۶ء
تعداد:	۳۰۰۰

نوٹ: رہبر معظم امام مجتبیٰ خامنہ ای کا فوری تعارف کروانے کے لیے جلدی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

CamScanner

فہرست

جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت کا جوہر/حسین کاظم زاد/اداریہ ---------- ۵

میں اپنے خون سے لکھ دیتا ہوں!/انٹرویو/فرید کی زبانی ---------- ۱۰

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی شخصیت اور زندگی/انٹرویو ---------- ۱۵

۱۹۸۶ء سے جناب سید مجتبیٰ کے ساتھ ہم مباحثہ رہے/انٹرویو ---------- ۳۱

میرا بیٹا مجتبیٰ ---------- ۳۶

آپ کا آنا ضروری ہے!: آیت اللہ بہجت/انٹرویو ---------- ۳۸

پیامِ امت (۱) ---------- ۴۲

کیا ہی خوبصورت جرم!/انٹرویو ---------- ۴۷

قم بنیادی مرکز ہے!/انٹرویو ---------- ۵۶

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے فقہی نظریات میں تقیہ کے مقام کا ایک آزادانہ جائزہ/یادداشت ---------- ۶۲

قرآن و روایات کا خدا، وہی فقہ و اصول کا خدا ہے/انٹرویو ---------- ۶۳

منفرد عید: عیدِ غدیر/یادیں ---------- ۷۲

حجۃ الاسلام مجید قاسمی کی یادداشتیں ---------- ۷۴

واقعات کے قلب میں تیس سالہ موجودگی/انٹرویو ---------- ۷۸

پیامِ امت (۲) ---------- ۸۳

نئے دور کے شیخ بہائی/انٹرویو ---------- ۸۶

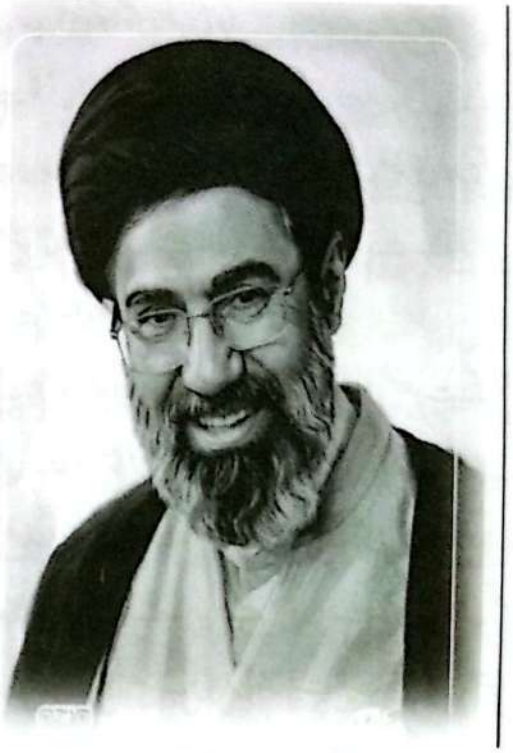
آقا مجتبیٰ کی اولین ترجیح/انٹرویو ---------- ۹۱

وصی، معاشرے کی روح/یادداشت ---------- ۹۸

CamScanner

انتخاب کی روداد/انٹرویو ---------- ۱۰۴
لہ ملکۃ الاجتہاد: آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے علمی مقام اور اجتہاد کی گواہی: فقہائے حوزۂ علمیہ ---------- ۱۰۷
ان کی مرجعیت صرفِ ایران تک محدود نہیں ہے/انٹرویو ---------- ۱۱۲
محرز/گفتگو ---------- ۱۱۶
پیامِ امت (۳) ---------- ۱۲۱
جس دن ضرورت ہوگی، اللہ خود دلوں کی رہنمائی فرمائے گا/انٹرویو ---------- ۱۲۴
منطقِ انتخاب/یادداشت ---------- ۱۳۰
امت کی قدر/گفتگو ---------- ۱۳۴
قوموں کی بعثت/انٹرویو ---------- ۱۳۶
خامنہ ای جوان ہو گئے/مضمون ---------- ۱۳۹
جائزہ ---------- ۱۴۱





جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت کا جوہر

حسین کاظم زاد

اداریہ

رہبر معظم کی شہادت اور اس کے بعد پیش آنے والے المناک حالات، نیز تیسری مسلط کردہ جنگ کے ہنگام، عوام کی اہم ترین فکرمندیوں میں سے ایک یہ تھی کہ شہید رہبر کا جانشین کون ہوگا؟ البتہ انقلابی حلقوں کے احباب یہ تشویش برسوں سے اپنے دلوں میں لیے ہوئے تھے اور خاموشی سے ایک دوسرے سے پوچھا کرتے تھے: "آقا کے بعد کیا ہوگا؟!"

بعض کا خیال تھا اور کچھ تو تقریباً یقین رکھتے تھے کہ رہبر معظم پرچمِ انقلاب کو حضرت صاحبِ الزمانؑ کے سپرد کریں گے، لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ کچھ افراد کی امیدیں شاید آیت اللہ رئیسی سے وابستہ تھیں، لیکن عزیزِ دل آیت اللہ رئیسی کی شہادت کے بعد یہ تشویش مزید بڑھ گئی، اور ہم سب اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے منتظر رہے۔

رہبر معظم کی شہادت کے فوراً بعد مجلسِ خبرگانِ ملت کی نہایت دشوار ذمہ داری کا آغاز ہوا۔ خبرگان کے خلاف دشمن کی مسلسل دھمکیوں اور مجلسِ خبرگان کے اجلاس کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی نے صورتِ حال کو انتہائی پیچیدہ بنا دیا تھا۔ قم اور تہران میں رہبر کے انتخاب کے لیے متوقع اجلاس کے کئی مقامات دشمن کے میزائل حملوں کا نشانہ بنے۔ اگر دشمن اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو رہبر کے انتخاب کا عمل شدید پیچیدگی اور تعطل کا شکار ہو سکتا تھا۔

بالآخر، تمام تر خطرات کے باوجود، خبرگانِ امت نے غیر معمولی جرأت و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالمشافہ اجلاس منعقد کیا اور اس نہایت اہم ذمہ داری کو انجام تک پہنچاتے ہوئے حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کو اسلامی جمہوریۂ ایران کا رہبر منتخب کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انیسویں رمضان المبارک کی شب ہم سب بیداری کے مراسم میں شرکت کے لیے تہران کی ہیئتِ عشاق الحسینؑ گئے ہوئے تھے کہ اسی دوران جناب سید مجتبیٰ کے انتخاب کی خبر پہنچی۔ پورا مجمع بے اختیار جوش میں آگیا۔ تکبیروں، صلوات، نعروں اور اشکوں کی گونج ہر طرف پھیل گئی، بالکل اسی طرح جیسے اس رات ایران بھر میں منعقد ہونے والی دیگر شب بیداری کی مجالسِ میں ہوا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ ان لوگوں میں سے اکثر ایسے تھے جنہیں جناب سید مجتبیٰ کی ایک منٹ کی تقریر یا ویڈیو بھی یاد نہ تھی، لیکن وہ ان سے اس طرح محبت کرتے تھے

گویا برسوں سے انہیں جانتے ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت کا آشکار ظہور تھا، ورنہ آخر کیوں ایک ایسے مظلوم اور گمنام جناب سید مجتبیٰ، جس پر دشمن نے زبان اور عمل دونوں سے ظلم و بہتان کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، اس طرح ملت اور خبرگان کے دلوں کے محبوب بن گئے؟ البتہ سبھی اس حقیقت کو درک کر رہے تھے، اسی لیے بلند آواز سے نعرہ لگا رہے تھے: "دستِ خدا عیاں شد، خامنہ ای جوان شد۔"

ماہ رمضان کی جنگ کے زخمی، ایک معجزے سے مشابہ انداز میں، "خیابان کشور دوست" کے مقتل سے صحیح سلامت باہر نکل آئے تھے، اور یہ بھی اس انتخاب کے معانی و مفاہیم میں ایک اور گہرا مفہوم اضافہ کر رہا تھا۔ وہ دشمن کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ شخصیت تھے، اور اٹھائیس فروری کے حملے کے اہم اہداف میں سے ایک انہیں شہید کرنا بھی تھا۔ ہمارے شہید امام فرمایا کرتے تھے کہ اسلام میں امت کی قیادت و رہبری کا معاملہ بنیادی طور پر انسانوں کے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی اسے ایک حیرت انگیز انداز سے مقرر فرماتا ہے۔ ہم نے اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا؛ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت کو حرکت میں دیکھا، اسی دستِ قدرت کو جس کے بارے میں حضرت امام روح اللہ فرمایا کرتے تھے: "میں اس دستِ قدرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ انقلاب کی رہنمائی میں مصروف ہے!"

اس خصوصی شمارے کی داستان

سید مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب کے بعد ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اپنے نئے رہبر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان سکے۔ لیکن خود انہوں نے گمنامی کو اختیار کیا تھا، اور یہی بات ان کی شخصیت کا تعارف کرانے میں نہایت دشواری کا باعث بن رہی تھی۔

جناب سید مجتبیٰ کو اچھی طرح جاننے والے بہت سے افراد یا تو جامِ شہادت نوش کر چکے تھے، یا پھر جنگ کے دوران پیش آنے والے سیکیورٹی حالات کے باعث، جو اس وقت ایک فطری اور ناگزیر امر تھا، دسترس میں نہیں تھے؛ ان کے اہلِ خانہ سے لے کر ان کے بہت سے قریبی ساتھیوں اور دوستوں تک۔

اس کے باوجود کچھ ایسے افراد موجود تھے جو ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں سے روشناس کرا سکتے تھے، اور یہی خود ایک گراں قدر سرمایہ تھا۔ دوسری جانب، ان کے پیغامات بھی یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آ رہے تھے۔ یہ ایسے متون تھے جن پر اہلِ قلم کی اصطلاح میں اپنے مصنف کی واضح شناخت ثبت تھی۔ ان متون کا اسلوب منفرد تھا اور وہ اپنے مصنف کے افکار، طرزِ فکر اور روحانی و اخلاقی اوصاف کے مختلف پہلوؤں کو قارئین کے سامنے بخوبی آشکار کر رہے تھے۔

جناب سید مجتبیٰ سے متعلق یہ خصوصی شمارہ رہبرِ معظمِ انقلاب کے تعارف کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے، جس کا بڑا حصہ ان کے قریبی ساتھیوں، شاگردوں اور ان سے وابستہ افراد کے ساتھ ہونے والی گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے تین اہم پیغامات پر بعض فکری تشریحات و تجزیات بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔

یقیناً یہ تعارف مکمل نہیں ہے، اور نہ ہی نشریہ «خط» ایسا کوئی دعویٰ کرتا ہے۔ البتہ کوشش یہی رہی ہے کہ یہ حتی الامکان جامع ہو؛ یعنی ان کی شخصیت کے تین بنیادی پہلوؤں پر محیط ہو: علمی و فکری پہلو، روحانی و معنوی پہلو، اور عملی و سیاسی پہلو۔ یہی وہ جامع اوصاف ہیں جن کے حوالے سے رہبرانِ انقلاب ہمیشہ ممتاز اور معروف رہے ہیں۔

تاہم ان تینوں پہلوؤں کا حاصل وہی چیز ہے جو کسی انسان کی شخصیت کا اصل جوہر تشکیل دیتی ہے؛ وہ بنیادی صفت جو انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں کو ایک وحدت میں جمع کرتی ہے اور البتہ انہیں اپنا مخصوص رنگ بھی عطا کرتی ہے۔ شہید رہبر نے امام خمینیؒ کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: "امام یقیناً ایک عظیم اور ممتاز فقیہ تھے، فلسفی تھے، اور عرفانِ نظری میں بھی صاحبِ نظر تھے۔ ان تمام علمی اور فنی میدانوں میں وہ اپنے زمانے کے نمایاں ترین افراد میں شمار ہوتے تھے، لیکن امام کی عظیم شخصیت صرف انہی خصوصیات پر قائم نہیں تھی، بلکہ ان کی اصل شخصیت اس آیتِ مبارکہ کے مضمون کے تحقق میں جلوہ گر تھی: ﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾۔ امامؒ نے ان بلند علمی بنیادوں کے باوجود اللہ کی راہ میں مجاہدت کے میدان میں قدم رکھا، اور عمر بھر اسی راہ پر ثابت قدم رہے، یہاں تک کہ ایک عظیم تاریخی تحریک برپا کی۔"

انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں وحدت، ہم آہنگی اور یکسانیت موحدین کی نمایاں صفات میں سے ہے۔ ایک موحد کی سب سے بڑی ترجیح ہی اس کی اصل شخصیت کی آئینہ دار ہوتی ہے؛ اس کی زندگی میں ایک ایسا مرکزی نقطہ ہوتا ہے جس پر وہ اپنی تمام متاع نچھاور کرنے کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ یہی نقطۂ عزم در حقیقت اس کی پوری زندگی کی داستان بن جاتا ہے، ایسی داستان جسے شاید چند سطروں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

شاید جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت کے جوہر کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے: اپنی ذات سے گزر کر شہید رہبر کی نصرت و خدمت کو اپنا مقصدِ حیات بنالینا۔ یہی کیفیت کسی نہ کسی مرحلے میں شہید رہبر کی زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہے؛ ایک دور میں اپنے والد کی خدمت میں اور دوسرے مرحلے میں حضرت امام روح اللہؒ کے ساتھ اپنے تعلق میں۔ یہی وصف شہید سید حسن نصر اللہ اور عزیزِ دل شہید آیت اللہ رئیسی کی زندگیوں میں بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

جناب سید مجتبیٰ نے یہ راہ اختیار کی تھی کہ وہ اپنے ولی کی خدمت میں رہیں۔ اگر یہ راہ اپنے حقیقی مفہوم کے ساتھ جاری رہتی، تو ان کے لیے اپنی بہت سی خواہشات اور مواقع سے دست بردار ہونا ناگزیر ہوجاتا۔ شاید سب سے پہلے انہیں حوزوی زندگی کے معروف اور معمول کے راستے سے صرفِ نظر کرنا پڑا۔ قم میں قیام، تدریس، تصنیف اور شاگردوں کی تربیت اگرچہ ان کی زندگی سے بالکل ختم نہ ہوتی، لیکن انہیں کہیں زیادہ معمول سے ہٹ کر اور بڑی احتیاط کے ساتھ انجام دینا ہوتا۔ اسی طرح تبلیغِ دین اور مسجد کی امامت و خدمت، جو ان کی پسندیدہ سرگرمیوں میں شامل تھیں، وہ تقریباً ان سے محروم رہے۔

جناب سید مجتبیٰ، شہید رہبر کے معاون اور مشیر تھے، لیکن ایسی معاونت کے ساتھ جس میں معمول سے کہیں زیادہ پابندیاں اور دشواریاں تھیں؛ اور اس کی بنیادی وجہ شہید رہبر کے ساتھ ان کا قریبی خاندانی تعلق تھا۔ شہید رہبر کے پہلو میں رہ کر مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے انہیں گمنامی اور بے نام و نشانی کو شعوری طور پر اختیار کرنا پڑا۔ مثلاً بیتِ رہبری میں ان کا کوئی مستقل دفتر یا مخصوص کمرہ نہ ہونا، بہت سی ملاقاتوں بلکہ بعض نمازوں میں بھی حاضر نہ ہونا، یا اگر حاضر ہوں تو پہلی صف میں نہ کھڑے ہونا، دشنام اور تہمتیں سن کر خاموش رہنا، اپنے ہم درسوں اور ہم مسلک علماء میں سے بہت سوں سے صرف اس لیے روابط محدود رکھنا کہ کہیں جانشینی کا شائبہ پیدا نہ ہو، اور اپنی علمی، عملی اور ذاتی زندگی کے ہر مرحلے میں غیر معمولی احتیاط اور ملاحظہ اختیار کرنا۔ اگر جناب سید مجتبیٰ شہید رہبر کے اعلیٰ معاون نہ ہوتے تو ان میں سے بہت سی احتیاطوں کی شاید کوئی ضرورت ہی نہ ہوتی، یا کم از کم ان امور کو اتنی اہمیت حاصل نہ

ہوتی۔ لیکن جناب سید مجتبیٰ نے یہ تمام پابندیاں، محرومیاں اور گمنامیاں اپنی رضا و رغبت سے قبول کیں تاکہ شہید رہبر کے مددگار بن سکیں۔ اور اس مقام پر شہید رہبر کا مددگار ہونے کا مطلب یہی تھا کہ اپنی ذات کو شہید رہبر میں فنا کرنا اور خود محو ہو جانا۔

جناب سید مجتبیٰ کی نمایاں خصوصیات

وہ اپنا یہ جوہر ان اوصاف میں جھلکتا ہوا دکھاتے ہیں جن کے ذریعے بہت سے لوگوں نے جناب سید مجتبیٰ کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے بعض صفات اس بنیادی جوہر کا واضح اور لازمی نتیجہ ہیں، جبکہ بعض دیگر اسی سے نشوونما پانے والی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان اوصاف میں نمایاں طور پر تواضع، شہرت سے گریز، سادہ زندگی، عوام پر حقیقی ایمان، مخصوص روحانی سیر و سلوک، محروم طبقات کی طرف خصوصی توجہ، ممتاز علمی صلاحیت اور شخصیت، آزادیِ فکر و کردار، مسائل پر گہری بصیرت، تدبر و فراست، اور دشمن کو پہچاننے اور اس کا مقابلہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت شامل ہیں۔

تواضع: تواضع وہ پہلی صفت ہے جسے تقریباً ہر اس شخص نے محسوس کیا ہے جسے جناب سید مجتبیٰ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

شہرت سے گریز: جناب سید مجتبیٰ اس بات کا غیر معمولی اہتمام کرتے تھے کہ ان کا نام حوزہ، یونیورسٹی یا معاشرے میں نمایاں نہ ہو۔ حتیٰ کہ تدریس کے اعلان، دروس کی صوتی ضبطگی یا ان کی تشریحات کی اشاعت جیسے سادہ امور میں بھی وہ اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح غربا کی خدمت کے وہ تمام منصوبے جو خود ان کی نگرانی یا ان کے شاگردوں کے ذریعے انجام پاتے تھے، ہمیشہ شہید رہبر کے نام سے متعارف کرائے جاتے تھے۔

محروم طبقات کی طرف خصوصی توجہ: خود جناب سید مجتبیٰ فرمایا کرتے تھے کہ محروموں سے یہ محبت انہیں اپنے شہید والد سے ورثے میں ملی ہے۔ مشہور تھا کہ جو شخص جناب سید مجتبیٰ سے ملاقات کا خواہاں ہوتا، اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ محروم طبقات کی خدمت سے متعلق کوئی منصوبہ یا مسئلہ ساتھ لے کر آئے، تاکہ ملاقات کا امکان زیادہ ہو جائے۔ کیونکہ وہ خود فرمایا کرتے تھے:

"غریبوں کے لیے میرے پاس ہمیشہ وقت ہوتا ہے۔"

عوام پر حقیقی ایمان: یہ خصوصیت ان کے پہلے ہی پیغام میں پوری وضاحت کے ساتھ نمایاں ہوئی، جہاں انہوں نے آیتِ کریمہ: ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے اسے عوام کی قیادت کے مسئلے پر منطبق کرنے کا مشاہدہ کیا ہے۔ عوام کے بارے میں ان کی توحیدی نگاہ اور دینی مردم سالاری پر ان کا پختہ یقین، اسلامی انقلاب کے انہی نئے اور دلکش افکار میں سے ہے جن پر وہ پورے اخلاص اور کامل یقین کے ساتھ ایمان رکھتے ہیں۔

مخصوص روحانی سیر و سلوک: اگرچہ جناب سید مجتبیٰ کا درسِ اخلاق، مروجہ معنوں میں، مستقل طور پر منعقد نہیں ہوتا تھا، لیکن ان کے شاگردوں کے مطابق ان کی تدریس ان کے اندر اپنے اعمال و کردار، خصوصاً نماز، کے بارے میں زیادہ محاسبہ اور مراقبہ پیدا کر دیتی تھی۔ ایران بھر میں اہلِ سلوک اور اہلِ معرفت سے مسلسل رابطہ رکھنا بھی جناب سید مجتبیٰ کی اہم فکری و روحانی ترجیحات میں شامل تھا، جسے وہ اپنے بڑے بھائی آقا مصطفیٰ کے ساتھ مل کر آگے بڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی جانب سے نقل ہونے والے سنگین روحانی مراقبات اور عبادی اعمال بھی ان کی روحانی سیرت کا نمایاں حصہ شمار ہوتے ہیں۔

ممتاز علمی شخصیت: علم حاصل کرنا اور علم کو محورِ حیات بنانا جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت کے بنیادی ستونوں اور نمایاں خصوصیات میں سے ہے۔ اس لیے کہ فرد اور معاشرے کی تربیت، تہذیب و تمدن کی تعمیر، اور دیگر تمام بنیادی امور علم ہی پر استوار ہوتے ہیں؛ وہی

حقیقت جسے شہید رہبر بارہا اس فرمان کے ذریعے بیان فرمایا کرتے تھے: «العلم سلطان»۔

جناب سید مجتبیٰ کی زندگی کا ایک طویل اور نہایت فعال حصہ حوزہ علمیہ کی علمی مجالس میں گزرا، جس کا ثمر قابلِ توجہ علمی جدتیں، پررونق درس، اور شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ فقہ، یعنی گہوارے سے قبر تک انسان کی زندگی کے کامل اور حقیقی نظامِ ہدایت کا نظریہ، وہ علم ہے جس پر جناب سید مجتبیٰ نے دیگر اسلامی علوم کی نسبت زیادہ وقت صرف کیا۔ البتہ اس کی ایک اہم وجہ شہید رہبر کی وہ خصوصی ہدایت بھی تھی جس میں انہوں نے جناب سید مجتبیٰ کو فقہ پر زیادہ توجہ مرکوز رکھنے کی تلقین فرمائی تھی۔

شہید رہبر کئی مرتبہ فرمایا کرتے تھے کہ: "ہمارے خاندان میں سبھی کتاب دوست اور مطالعہ کرنے والے ہیں۔" اب اندازہ کیجیے کہ اس قدر علمی اور مطالعہ پسند خاندان میں "آقایِ مطالعہ" کا لقب خاص طور پر جناب سید مجتبیٰ کو ملا تھا۔

علمی حریت: اگرچہ جناب سید مجتبیٰ اکابر علما کا بے حد احترام کرتے تھے، لیکن ان کے نزدیک خود علم اور حقیقت کا مقام ہر چیز سے بلند تھا اور یہی چیز ان کی علمی حریت اور استقلال کا سبب بنتی تھی۔ اپنے شہید والد سے گہری عقیدت رکھنے کے باوجود، بعض فقہی اور اصولی آرا میں انہوں نے ان کے ساتھ علمی بحث کی اور اس کے بعد بھی اپنی تحقیق کی بنیاد پر اپنا مستقل نظریہ برقرار رکھا۔

مسائل پر گہری دسترس: کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کوئی شخص کسی موضوع سے آگاہ کرنے کی غرض سے جناب سید مجتبیٰ کے ساتھ نشست منعقد کرتا، لیکن گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوتا کہ جناب سید مجتبیٰ اس موضوع پر پہلے ہی مکمل احاطہ رکھتے ہیں، اور اب خود اسے ان سے مزید رہنمائی اور آئندہ کے لائحۂ عمل کے بارے میں استفادہ کرنا چاہیے۔

فراست و تدبر: مؤمن کی کیّاست دنیاوی چالاکی سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہ ایسی بصیرت اور حکمت ہے جو ایک موحد کی سادگی اور اخلاص کے ساتھ جمع ہو جاتی ہے۔ جناب سید مجتبیٰ مجالس میں پوری توجہ سے سنتے تھے، لیکن ہرگز سادہ لوح نہ تھے۔ تزویراتی اور عملی سطح پر نتائج اخذ کرنا، واقعات کی جزئیات، افراد کے حالات اور سابقے سے مکمل آگاہی رکھنا، مختلف میدانوں میں مختلف افراد کے ذریعے امور کو آگے بڑھانا، معلومات کی صحیح درجہ بندی کرنا، اور ہر کام کے ماحول اور تقاضوں کو دوسرے ماحول سے الگ رکھتے ہوئے ان کی رعایت کرنا، یہ سب اسی مطلوبہ کیّاست کی نمایاں علامتیں تھیں۔

دشمن کی نگاہ میں اہم شخصیت: دشمن برسوں پہلے ہی جناب سید مجتبیٰ کی غیر معمولی اہمیت کو سمجھ چکا تھا، اسی لیے اس نے ۱۹۹۰ء کی دہائی ہی سے اپنی شدید ترین تبلیغی یلغار کا رخ ان کی طرف کر رکھا تھا۔ اس دشمنی کا نقطۂ عروج ۲۰۰۹ء (فتنۂ ۸۸) کے دوران تہران کی سڑکوں پر لگنے والے نعروں اور معاند ذرائع ابلاغ کی وسیع پروپیگنڈا مہم میں نمایاں طور پر دیکھا گیا۔ عالم اسلام کے یہ جوان رہبر، خواہ اپنے فکری مبادیات کے اعتبار سے ہوں یا محاذِ مقاومت کے ساتھ طویل اور قریبی تعلق کے باعث، بنیادی طور پر ایک امریکہ مخالف اور صہیونیت مخالف مزاج رکھتے ہیں، اور یہ حقیقت ان کے جاری کردہ پیغامات میں پوری وضاحت کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے۔



میں اپنے خون سے لکھ دیتا ہوں!

محمد مہدی حقانی

انٹرویو

حجۃ الاسلام والمسلمین محمد مہدی حقانی سے گفتگو کے تناظر میں آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی مجاہدانہ زندگی

شروع ہی سے ہماری کوشش تھی کہ ان کے ساتھ ایک تفصیلی گفتگو انجام دی جائے، لیکن ان کی جسمانی کمزوری اور علالت اس راہ میں حائل رہی۔ جناب سید مجتبیٰ کے ہم رزم اور جانباز (جنگ میں مجروح) ساتھی کی ان سے دوستی ۱۹۸۱ء ہی میں، نوجوانی کے زمانے میں، پہلے مدرسۂ علوی میں اور اس کے بعد محاذِ جنگ پر لشکر (ڈویژن) ۲۷ محمد رسول اللہؐ بٹالین حبیب بن مظاہر میں شروع ہوئی۔ یہ رفاقت آج تک اسی اخلاص اور استحکام کے ساتھ قائم ہے۔

حجۃ الاسلام والمسلمین محمد مہدی حقانی، جو مدرسۂ علمیہ آل یاسین کے متولی اور پندرہ جلدوں پر مشتمل مجموعۂ «منشورِ حوزہ و روحانیت» منظم کرنے والے ہیں، نے رسالہ «خط» کے ساتھ اس گفتگو میں رہبرِ انقلاب سے متعلق اپنی یادوں اور مشاہدات کا کچھ حصہ بیان کیا ہے۔

رہبرِ معظمِ انقلاب کی شخصیت کے تعارف کے سلسلے میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ ابتدا میں اگر آپ کوئی تمہیدی گفتگو فرمانا چاہیں تو ارشاد فرمائیں، اس کے بعد ہم اپنے سوالات پیش کریں گے۔

سب سے پہلی بات جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہوں گا، وہ اس تشویش سے متعلق ہے جو عراق میں بعض دوستوں کو حضرت آیت اللہ سیستانی کے بعد کے حالات کے بارے میں لاحق تھی۔ ان کی فکر یہ تھی کہ ان کے بعد کیا ہوگا؟ انہوں نے یہ تشویش شہید سید حسن نصر اللہ سے بیان کی۔ سید بھی ایران آئے اور دیگر اہم امور کے ساتھ اس مسئلے کو بھی شہید رہبر کی خدمت میں پیش کیا۔ شہید رہبر نے فرمایا: حضرت ولی عصرؑ پر کچھ ذمے داریاں ہیں، اور یہ ان ذمے داریوں میں سے ایک ہے، آپ فکر مند نہ ہوں!

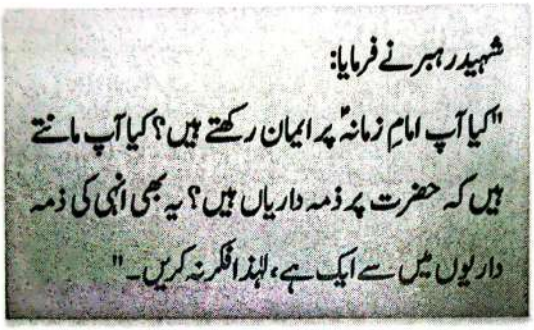
حاج آقا مجتبیٰ کے بارے میں بھی ان کی قیادت یا رہبری کے لیے بھی کسی نے کوئی اقدام یا کوشش نہیں کی۔ خود انہوں نے بھی کسی کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اگرچہ ان کی ملاقاتیں اور نشستیں بہت زیادہ ہوتی تھیں، لیکن وہ ان ملاقاتوں سے سختی کے ساتھ اجتناب کرتے تھے جن سے اس سلسلے میں کسی قسم کا شائبہ پیدا ہو سکتا تھا، خصوصاً مجلسِ خبرگانِ رہبری کے اراکین سے ملاقاتوں سے۔

وہ خود فرمایا کرتے تھے: "آؤ، میں اپنے خون سے لکھ دیتا ہوں کہ میں اس منصب کا طالب نہیں ہوں جو بعض لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

ان تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے، اور اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ان واقعات سے پہلے ان کا نام خود مجلسِ خبرگان میں بھی اس حوالے سے زیرِ بحث نہیں آیا تھا، بظاہر اس کے سوا کوئی توجیہ نظر نہیں آتی کہ یہ حضرت ولیِ عصرؑ کی خاص عنایت تھی، اور گویا عبا خود حضرت نے ان کے کندھوں پر ڈال دی۔ ان کے بارے میں سب سے اہم حقیقت یہی ہے، ورنہ اس منصب کے لیے نہ پہلے سے کوئی سابقہ موجود تھا اور نہ کسی قسم کی منصوبہ بندی۔

خط: جناب سید مجتبیٰ سے آپ کی طویل آشنائی رہی ہے، اور مختلف مواقع پر آپ کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہے۔ آپ ان کی شخصیت کو کس طرح بیان کریں گے؟

یہ واقعہ خود شہید رہبر کی یادداشتوں میں بھی مذکور ہے کہ شہید رہبر نے اپنے ایک کم سن فرزند کو بچپن ہی میں کھو دیا تھا۔ اس سانحے پر وہ بہت غمگین تھے۔ اسی دوران انہوں نے خواب میں سنا کہ ان سے کہا جا رہا ہے: "اس فرزند کے بدلے ہم تمہیں ایک ایسا بیٹا عطا کریں گے جو تمہاری ہی مانند ہوگا۔"



اگر علمی اعتبار سے دیکھا جائے تو جناب سید مجتبیٰ کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی غیر معمولی ذہانت ہے۔ وہ بے پناہ استعداد اور غیر معمولی فہم و فراست کے مالک ہیں۔ ان کے وہ رفقا جنہوں نے جوانی کے زمانے میں ان کے ساتھ علمی مباحثے کیے ہیں، سب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ آیت اللہ عندلیبی، جو خود علمی اعتبار سے نہایت ممتاز شخصیت ہیں، انہوں نے بھی خاص طور پر اسی نکتے پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ غیر معمولی ذہانت کے حامل ہیں۔

ان کا مطالعہ بھی اپنے والد کی طرح نوجوانی ہی سے مختلف علوم، خصوصاً تاریخ، میں نہایت وسیع تھا۔ اسی طرح انہوں نے بہت کم عمری میں حوزۂ علمیہ میں داخلہ لے لیا تھا، اس وقت جب انہوں نے ابھی ہائی اسکول بھی مکمل نہیں کیا تھا۔ غیر معمولی ذہانت، حوزہ میں ابتدائی عمر میں داخلہ، اور تقریباً چالیس سال پر محیط تدریس و تدرّس نے انہیں علمی اعتبار سے غیر معمولی ارتقا عطا کیا۔

ان کی زندگی کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جس سے اگرچہ اکثر لوگ واقف ہیں، لیکن شاید اس کی تفصیلات سے آگاہ نہیں۔ وہ یہ کہ جناب سید مجتبیٰ آسائشوں اور رفاہ میں پرورش نہیں پائے، بلکہ بچپن ہی سے سختیوں کا سامنا کرتے رہے۔ اس کی کچھ تفصیل عرض کرتا ہوں۔

انقلاب سے پہلے ان کے والد یا تو قید میں رہتے تھے یا جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انقلابی افراد کی زندگی بھی فقر و تنگ دستی اور مشقت سے لبریز تھی۔ انقلاب کے بعد بھی ابتدائی ایام اپنی مخصوص دشواریوں کے حامل تھے، اور پھر جنگ کا زمانہ آیا، جس میں وہ خود بھی عملی طور پر شریک رہے۔

خط: آپ جانتے ہیں، کون کون سے آپریشنوں میں شریک رہے؟

آپریشن کربلا۱، جو مہران شہر کی آزادی کے لیے انجام دیا گیا، اس میں وہ حبیب بٹالین[1] کے ساتھ موجود تھے۔ اس کے بعد کربلا۴، کربلا۵ اور تکمیلی کربلا۵ میں بھی شریک رہے۔ تقریباً ایک سال تک انہوں نے حبیب بٹالین میں ایک عام مجاہد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کی ذمہ داری ارٹلری میں تھی۔ حاج حسن محققی[2] حبیب بٹالین کے کمانڈر تھے، جو بعد میں بارہ روزہ اسرائیلی جنگ کے دوران جامِ شہادت نوش کر گئے۔

تکمیلی آپریشن کربلا ۵ میں دشمن کی جانب نون (ن) کی شکل کے مورچے بنائے گئے تھے، جو ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی ساخت اس طرح تھی کہ گاڑیاں ان کے اوپر سے گزر سکتی تھیں، جبکہ درمیان میں ایک نہر (کینال) موجود تھی۔ اس کے علاوہ مٹی کے پشتے اور بارودی سرنگوں کے میدان بھی تھے۔ یہ دفاعی مورچے تقریباً ناقابلِ تسخیر تھے؛ کیونکہ اگر مجاہدین درمیان سے آگے بڑھتے تو بارودی سرنگوں کا میدان حائل ہوتا، اگر

---

(۱) بٹالین حبیب بن مظاہر، لشکر (ڈویژن) ۲۷ محمد رسول اللہؐ کی ایک معروف بٹالین تھی۔

(۲) سردارِ شہید حاج محمد حسن محققی، سپاہ کے ادارۂ اطلاعات کے نائب سربراہ تھے، جو صیہونی رژیم کے حملوں میں ۱۵ جون ۲۰۲۵ء کو جامِ شہادت نوش کر گئے۔

خط: آپ کی نظر میں آقا مجتبیٰ کی روحانی کیفیت اور ماحول کے بارے میں کوئی ایسی بات ہے جس کا ذکر مناسب ہو؟

وہ عبادت کے نہایت پابند ہیں۔ ان کا ایک مستقل معمول یہ ہے کہ وہ اپنے ختمِ قرآن کو نمازِ نوافل کے دوران مکمل کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا: "میں اور حاج آقا مصطفی ہر اس صاحبِ روحانیت کے پاس گئے جس کا لوگوں نے ہمیں بتایا تھا۔" بعد میں فرمایا: "آخرکار ہمارے لیے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ روحانیت میں کوئی بھی شہید رہبر کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔"

میں ایک مرتبہ حاج آقا مجتبیٰ سے عرض کر رہا تھا کہ میری خواہش ہے شہید رہبر کی زیادہ سے زیادہ زیارت نصیب ہو۔ انہوں نے فرمایا: "میری بھی یہی کیفیت ہے۔ میں شہید رہبر کے گھر جاتا ہوں، ان کے چہرۂ مبارک کو دیکھتا رہتا ہوں، اور ان کے چہرے سے روحانی غذا حاصل کرتا ہوں۔"

وہ مسلسل آیت اللہ بہجت کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ خود فرماتے تھے: "آیت اللہ بہجت جو کچھ ارشاد فرماتے، میں اسے کاغذ پر لکھ لیتا اور پھر شہید رہبر کی خدمت میں عرض کرتا تھا۔"

اسی طرح وہ نہایت خاموشی اور اخلاص کے ساتھ محروم طبقات کی خدمت انجام دیتے تھے، اور آج بھی اس مقصد کے لیے ایک فلاحی ادارہ ان کی نگرانی میں کام کر رہا ہے۔ البتہ اس ادارے سے بھی زیادہ اہم ان کا محروموں کے بارے میں طرزِ فکر اور جذبۂ خدمت ہے، جس میں وہ شہید رہبر سے بہت مشابہ ہیں۔ اسی مناسبت سے شہید رہبر کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

سن ۲۰۱۰ء میں شہید رہبر کے سفرِ قم کے دوران عوام سے بالمشافہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ملاقات کرنے والوں میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے اپنی معاشی مشکلات کا ذکر کیا۔ لیکن ملاقات کے اختتام پر حضرت آقا اس شخص کا کوئی رابطہ یا پتہ لینا بھول گئے۔ دفتر کے ایک رکن، جو اس موقع پر شہید رہبر کی خدمت میں موجود تھے، بتایا کہ اس واقعے کی وجہ سے شہید رہبر پوری رات سو نہ سکے، اور آخرکار دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے مسجدِ جمکران چلے گئے۔

یہی احساس اور یہی دردِ دل حاج آقا مجتبیٰ میں بھی موجود ہے۔ اس جذبے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کی تمام توانائیاں اور وسائل محروم اور کمزور طبقات کی خدمت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

خط: یہ کہا جاتا ہے کہ جناب سید مجتبیٰ، شہید رہبر کے معاون تھے۔ شہید رہبر کس نوعیت کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کرتے تھے؟

شہید رہبر مختلف امور میں انہیں خصوصی ذمہ داریاں سونپتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک مرتبہ شہید رہبر نے انہیں معاشرے کے ثقافتی مسائل پر ایک جامع مطالعہ اور منصوبہ تیار کرنے کی ذمہ داری دی۔

آقا مجتبیٰ نے تقریباً دو سال اس موضوع پر مسلسل محنت کی، پھر اس کا حاصل شہید رہبر کی خدمت میں پیش کیا، اور شہید رہبر اس سے استفادہ فرمایا کرتے تھے۔ اس نوعیت کے بہت سے اہم اور خاموشی سے انجام دیے جانے والے کام شہید رہبر ان کے سپرد کرتے تھے، جنہیں وہ پوری ذمہ داری، توجہ اور اخلاص کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

خط: مزاحمتی محاذ سے متعلق ذمہ داریوں اور سرگرمیوں کے بارے میں کیا فرمائیں گے؟

وہ مزاحمتی محاذ میں فعال طور پر شریک رہے اور اس کے قائدین سے مسلسل رابطے میں تھے۔ جب بھی شہید سید حسن نصر اللہ اور حاج قاسم ایران آتے، حاج آقا مجتبیٰ کے ساتھ ان کی باقاعدہ نشستیں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا: "اگر شہید رہبر اجازت دیتے تو میری خواہش تھی کہ یمن چلا جاؤں۔" حقیقتاً وہ

جانا چاہتے تھے!۔ یہ بات اس امر کی واضح دلیل ہے کہ وہ اپنے لیے کسی خاص مقام یا امتیاز کے قائل نہیں تھے۔ آقا مجتبیٰ نے واقعی اپنی شخصیت کو خود تعمیر کیا ہے۔ تقویٰ اور روحانیت کے میدان میں وہ غیر معمولی مقام رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ولیِّ عصر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) نے لوگوں کے درمیان انہیں اس عظیم ذمہ داری کے لیے منتخب فرمایا۔ ان کی احتیاطیں آج بھی ویسی ہی ہیں جیسی انقلاب کے ابتدائی برسوں کے مخلص افراد کی تھیں۔ جب وہ دفتر میں پی جانے والی چائے کی قیمت تک باقاعدہ حساب کرکے ادا کرتے ہیں تو باقی معاملات میں ان کی دقت و احتیاط کا اندازہ خود کیا جاسکتا ہے۔ یہ سب اس حال میں ہے کہ انہوں نے شعوری طور پر اپنی زندگی کو ایک دینی طالبِ علم کی سادہ زندگی کے مطابق، اور اس کے محدود مالی وسائل کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔

انسان کی ذاتی زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جو لوگ امریکہ کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہیں، ان کی کمزوری کا آغاز اکثر یہیں سے ہوتا ہے؛ وہ مالی معاملات میں احتیاط سے کام نہیں لیتے، اور نتیجتاً وہ مطلوبہ شجاعت، بصیرت اور ایمانی استحکام سے محروم رہ جاتے ہیں۔

رہبرِ شہید نے مجلسِ خبرگان کو رہبر کے اوصاف کے بارے میں جو اہم نکات یاد دلائے تھے، ان میں ایک مالی امانت و پاکیزگی اور دوسرا شجاعت تھا۔ قیادت کے منصب میں یہ دونوں اوصاف فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

خط: آخر میں اگر کوئی بات باقی رہ گئی ہو تو ارشاد فرمائیں۔

اسلامی انقلاب کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ خطِ امام پوری قوت، استقامت اور صلابت کے ساتھ جاری رہے۔ رہبری کے بارے میں سب سے بنیادی معیار بھی یہی ہے کہ رہبر، امام اور شہید رہبر کے راستے کا حقیقی تسلسل ہو۔ حاج آقا مجتبیٰ کی فکری بنیادیں، علمی مقام، روحانی شخصیت اور ذاتی طرزِ زندگی اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ خطِ امام اور خطِ شہید رہبر پوری قوت اور استحکام کے ساتھ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

قرآنِ ناطق کا معنی

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

امام (ع) عالمِ بالا سے آئے ہیں۔ ہاں، یہ کہا گیا ہے کہ ہم بھی آپ کی طرح چلتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور...؛ یہ بات درست ہے، لیکن امام (ع) سے نچلے درجے کے بعض افراد کے بارے میں بھی ایسا ہے کہ ان کے تمام امور عالمِ بالا سے وابستہ ہوتے ہیں؛ تو پھر امام (ع) کا مقام تو اس سے کہیں بلند ہے، کیونکہ ان کی حقیقت اور جنس ہم سے مختلف ہے؛ یعنی وہ ابتدا ہی سے نور ہیں۔ ان کا نور ایک خاص زمان اور کیفیت میں خلق کیا گیا، جبکہ ہم بالکل اس طرح نہیں تھے؛ حتیٰ کہ انبیاء (ع) میں سے بھی کوئی اس کیفیت کا حامل نہیں تھا۔

امام (ع) کا فرمان قرآن کی تفسیر ہے؛ «قرآنِ ناطق» کا مطلب یہی ہے۔ دراصل امام (ع) کا طریقۂ زندگی، سکوت اور تمام حرکات و سکنات قرآن ہیں۔ امام (ع) کی طرف سے جو کچھ بھی صادر ہوتا ہے، خواہ قول کی صورت میں ہو یا عمل کی صورت میں، وہ سب عینِ قرآن اور قرآن کا ترجمان ہے۔



فرید کی زبانی

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی شخصیت اور زندگی

انٹرویو

ڈاکٹر فرید الدین حداد عادل، جناب سید مجتبیٰ کی اہلیہ، شہیدہ محترمہ زہرا حداد عادل کے بھائی ہیں؛ یعنی جناب سید مجتبیٰ کے بچوں کے ماموں۔ انہیں اب تک تقریباً انتیس برس سے جناب سید مجتبیٰ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جناب سید مجتبیٰ کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں ان کی یہ روایت ایک طرف ان کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے، اور دوسری طرف ان باتوں پر جو انہوں نے اپنی بہن سے سنی تھیں۔ زیرِ نظر متن نشریہ «خط» کے ساتھ تقریباً ساڑھے تین گھنٹے پر مشتمل ایک تفصیلی گفتگو کی مرتب اور مدون صورت ہے۔ اس گفتگو میں جناب ڈاکٹر فرید نے جناب سید مجتبیٰ کی زندگی کے اندرونی اور خاندانی ماحول پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور ان کی سماجی، عملی اور عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بھی بیان کیا ہے۔ اسی جامع زاویۂ نگاہ کے باعث، یہ گفتگو جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت اور حیات کا نسبتاً مکمل اور ہمہ گیر خاکہ پیش کرتی ہے۔

سادہ رہن سہن، سادہ پوشی اور خوش اخلاق

ہمارے شہید چچا حضرت آیت اللہ خامنہ ای کے بے حد شیدائی تھے۔ میرے والد بھی شہید رہبر کو جانتے تھے، لیکن میرے چچا جنگ کے زمانے میں کرمانشاہ میں اپنی ذمہ داریوں کے باعث شہید رہبر سے نہایت قریبی اور دلی تعلق قائم کر چکے تھے۔ اسی رفاقت کی بنا پر ۱۹۸۱ء کے موسمِ گرما میں انہوں نے شہید رہبر کو اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ ہمارے دادا کے کرج والے باغ میں مدعو کیا۔ وہیں میں نے پہلی مرتبہ نوجوان سید مجتبیٰ کو دیکھا۔

اس بات کو کئی سال گزر گئے تو ایک دن میرے والد نے مجھ سے کہا: "ایک بات ہے، میرے خیال میں فی الحال کسی کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون، اپنا تعارف کرائے بغیر، مدرسے میں زہرا کے رشتے کی بات کرنے آئی تھیں۔ ہم تو اس بات کے مخالف تھے کہ زہرا تعلیم کے دوران شادی کرے، اس لیے ہم نے انکار کر دیا۔ لیکن حال ہی میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ خاتون دراصل حضرت آقا کی اہلیہ تھیں۔" میں بولا: "زہرا کو زوجیت اس عمر میں پسند نہیں ہے۔" والد صاحب نے کہا: "ہاں، یوں ہی کہتی ہے، لیکن فی الحال بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ کنکور (انٹر کے بعد یونیورسٹی ٹیسٹ) کے بعد آئیں، پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" رشتہ طے ہونے کے وقت جناب سید مجتبیٰ نے ابھی لباسِ روحانیت اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ

نہایت سادہ طرزِ زندگی رکھنے والے، سادہ لباس پہننے والے، خوش اخلاق اور کم مزاح کرنے والے انسان تھے۔

قم میں مختصر قیام

میری بہن حفاظتی انتظامات سے بہت نالاں ہوتی تھی۔ عقد کے زمانے میں وہ کہا کرتی: "اس مشکل کا کیا کریں؟ تم لوگ خوش قسمت ہو کہ آزادی سے آتے جاتے ہو!" ایک مرتبہ میں نے مذاق میں کہا: "جب باہر جاؤ تو کوئی ایسا بازار یا شاپنگ سینٹر تلاش کرو جس کے دو دروازے ہوں۔ ایک دروازے سے اندر جاؤ، محافظوں سے کہہ دو کہ ہم ذرا اندر گھوم کر آتے ہیں، پھر دوسرے دروازے سے نکل جاؤ۔"

شادی کے آغاز میں میری بہن نے جناب سید مجتبیٰ سے کہا: "میں تہران رہنا چاہتی ہوں۔" سید مجتبیٰ نے جواب دیا: "میں ایک دینی طالبِ علم ہوں، درس بھی پڑھتا ہوں اور پڑھاتا بھی ہوں۔ اگر ممکن ہو تو چند ماہ قم میں رہ کر دیکھ لیں، پھر فیصلہ کر لیجیے۔" میری بہن کی قم میں رہنے سے ہچکچاہٹ کی چند وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ تہران میں یونیورسٹی کی طالبہ تھیں، دوسری یہ کہ ان کی ملازمت بھی تہران میں تھی، اور تیسری وجہ یہ تھی کہ ان کا پورا خاندان بھی وہیں مقیم تھا۔

چنانچہ وہ چند ماہ قم میں رہے، پھر حاج آقا مجتبیٰ تہران واپس آ گئے اور اپنی زندگی کا ایک نیا معمول اختیار کیا۔ وہ ہفتے کے تین چار دن قم میں رہتے اور باقی دو تین دن، خصوصاً آخرِ ہفتہ، تہران میں گزارتے۔ بعد میں جب بچوں کی ولادت ہوئی تو صبح سویرے قم جاتے اور رات کو واپس تہران آ جاتے۔ لیکن اپنی اہلیہ کے احترام اور ان کی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہوں نے کبھی اپنے اہلِ خانہ کو مستقل طور پر قم منتقل نہیں کیا۔

فرزندِ رہبر کی زندگی

آقا مجتبیٰ کی زندگی نہایت سادہ اور ایک حقیقی دینی طالبِ علم کی زندگی ہے۔ جب وہ قم میں مقیم تھے تو ایک نہایت سادہ سے گھر میں رہتے تھے، جہاں گھریلو سامان بھی انتہائی محدود تھا۔ یہاں تک کہ گھر کا فرش بھی صرف سادے کف پوش سے ڈھکا ہوا تھا۔ بعد میں جب وہ تہران واپس آئے تو تقریباً ستر، اسی مربع میٹر (تقریباً ۴ مرلے) کے ایک چھوٹے سے مکان میں سکونت اختیار کی۔ میری بہن ایک اسکول میں ملازمت کرتی تھیں اور اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا بچا کر آہستہ آہستہ ایک مشینی قالین اور ایک آرام دہ صوفہ خرید لیا۔ وہ صوفہ سبز رنگ کا تھا۔ اب بمباری کے بعد اسی گھر سے جو سب سے بڑی چیز باقی بچی ہے، وہ یہی صوفہ ہے۔

رشتہ طے ہونے کے وقت جناب سید مجتبیٰ نے ابھی لباسِ روحانیت اختیار نہیں کیا تھا۔ وہ نہایت سادہ طرزِ زندگی رکھنے والے، سادہ لباس پہننے والے، خوش اخلاق اور کم مزاح کرنے والے انسان تھے۔

ہماری اپنی پرورش البتہ نسبتاً آسودہ ماحول میں ہوئی تھی۔ ۱۹۷۱ء میں ہمارا گھر پاسدارانِ کے علاقے میں تھا، اور ہمارے دادا مالی اعتبار سے خوش حال تھے۔ اسی وجہ سے میری بہن کے لیے اس سادہ اور محدود زندگی کو اختیار کرنا یقیناً بہت ہی زیادہ دشوار تھا۔ یقین کیجیے! اگر مہینے کے آخر میں حاج آقا کی اہلیہ کی تنخواہ نہ آتی تو ان کے گھر کا نظامِ زندگی چلانا مشکل ہو جاتا، جبکہ دوسری طرف لوگوں میں یہ افواہیں گردش کرتی تھیں کہ ان کے پاس اصطبل، گھوڑے ہیں، عالی شان ویلا ہے اور ان کے بچے انگلستان میں پیدا ہوئے ہیں!

مختصر آیہ کہ ان کی زندگی میں سختیاں اور مالی محدودیتیں بہت زیادہ تھیں۔ سوچیے! انسان رہبر کا فرزند ہو، لیکن اپنی اہلیہ اور بچوں کے

ساتھ آزادی سے کسی معمولی دکان تک بھی نہ جا سکے! سفر پر جائے تو ہر قدم پر پابندیوں کا سامنا ہو! مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ہم شمالی ایران گئے تھے۔ ہم سمندر کے کنارے تھے۔ میں نے کہا: "حاج آقا! آیئے، سمندر میں نہاتے ہیں۔" انہوں نے انکار کر دیا۔ میں نے پھر کہا: "اچھا، کم از کم کپڑوں سمیت ہی پانی میں آ جایئے۔" بالآخر وہ راضی ہو گئے۔ اسی دوران ان کا چشمہ گم ہو گیا، اور بعد میں اس کا صرف ایک شیشہ ملا۔ اس کے بعد وہاں وہ اسی ایک عدسے کو آنکھ کے سامنے رکھ کر کتاب پڑھا کرتے تھے اور ہنستے ہوئے مجھ سے کہتے: "فرید! میں نے اپنی عقل تمہارے حوالے کیوں کر دی؟ تین دن سے اسی ایک شیشے کو پکڑ کر کتاب پڑھ رہا ہوں!" اسی سفر میں حاج آقا نے ایک ایسی بات کہی جو ان کی زندگی کی سختیوں اور پابندیوں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: "فرید! مجھے تو یاد ہی نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی سمندر میں کھل کر تیراکی کی ہو۔" ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کو تو اس بات کی اتنی خوشی ہوئی کہ اس کے والد سمندر کے کنارے آئے ہیں، وہ کئی دن تک بڑے شوق سے اس واقعے کا ذکر کرتا رہا۔

بعد کے برسوں میں، جب وہ زیادہ پختہ ہوئے، تو دفتر کی نہایت حساس، پیچیدہ اور دشوار ذمہ داریاں بھی ان کے سپرد کی جانے لگیں۔ اعلیٰ حکام کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو حل کرنا اور اسی نوعیت کے دوسرے اہم امور ان کی ذمہ داریوں میں شامل تھے۔

کلیجی فروشی

ایک رات میں ان کے گھر گیا اور کہا: "اٹھیے، آج باہر چلتے ہیں۔" مجھے معلوم نہیں تھا کہ حاج آقا اس طرح باہر جانے کے عادی نہیں ہیں۔ پھر میں نے کہا: "زہرا خانم! آپ ہی چلیں، ہم باہر چلتے ہیں۔ ایک بہت اچھی کلیجی فروش کی دکان ہے، جو میری پسندیدہ جگہ ہے۔ میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ بھی وہاں جاتا ہوں۔ آج رات آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔" انہوں نے جواب دیا: "میں اپنے شوہر کے بغیر کہیں نہیں جاؤں گی۔" میں نے بہت اصرار کیا، لیکن وہ نہ مانیں۔ میرے لیے آج بھی یہ ایک سوال ہے کہ زہرا شہید کیوں ہوئیں؛ سچ کہوں تو کبھی کبھی مجھے ان پر رشک آتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے کبھی حاج آقا کو تنہا نہیں چھوڑا۔ خیر، اس رات میں بچوں کو لے کر کلیجی فروشی چلا گیا۔ اگلی صبح حاج آقا نے مجھے فون کیا اور فرمایا: "آقا فرید! کل رات آپ نے بڑی زحمت کی، اس کے لیے بہت شکریہ۔" انہوں نے صرف شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ میں نے کہا: "ارے بھائی! میں تو آپ کے بچوں کا ماموں ہوں!" لیکن وہ اس بات کے پابند تھے کہ کسی بھی احسان یا محبت پر ضرور شکریہ ادا کریں۔

ان کی زندگی کی ایک اور محدودیت یہ تھی کہ وہ مختلف تقریبات اور بچوں کی سرگرمیوں میں ہمیشہ اپنے بچوں کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک مرتبہ ابتدائی جماعتوں کے بچوں کے لیے فٹبال کا پروگرام رکھا گیا۔ پھر طے ہوا کہ ہر بچہ اپنے والد کے ساتھ آئے۔ حاج آقا نے فرمایا: "آقا فرید! میں عبا و عمامہ اتار کر

دوسرے والدین کی طرح بچوں کے ساتھ فٹبال نہیں کھیل سکتا۔" میں نے کہا: "تو پھر میں آپ کی جگہ کھیل لیتا ہوں۔"

مجھے یاد ہے کہ ہماری نانی کا انتقال ہوا تھا، لیکن حاج آقا اس مجلسِ فاتحہ میں شریک نہ ہو سکے۔ تقریب ختم ہونے کے بعد انہوں نے اپنی دستِ تحریر سے نانی کے ہر ایک فرزند کے نام الگ الگ خط لکھا اور عدمِ شرکت پر معذرت خواہ ہوئے۔ چونکہ ہماری نانی ایک شہید کی والدہ تھیں، اس لیے انہوں نے اپنے خط میں لکھا: "میں اس مجلس میں شرکت کی سعادت سے محروم رہا۔ ان شاء اللہ وہ آخرت میں ہمارا ہاتھ تھامیں گی۔"

جب ان کے پہلے فرزند کی ولادت رسالت اسپتال میں ہوئی، تو وہ اس وقت لباسِ روحانیت میں نہیں تھے۔ انہوں نے وہی جیکٹ پہن رکھی تھی جو میری والدہ ہمارے دونوں کے لیے لائی تھیں اور اتفاق سے ہم دونوں ایک جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ جب وہ اسپتال میں چل پھر رہے تھے تو عملے کو معلوم ہو گیا کہ وہ رہبر کے فرزند ہیں۔ اسی دوران وہ کسی کام سے باہر چلے گئے اور میں اندر آ گیا۔ اچانک دربان نے مجھے مخاطب کر کے کہا: "حاج آقا! آپ کی خدمت میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں، بہت بہت مبارک ہو!۔ یہ کتنی بڑی سعادت تھی! اس نے مجھے آقا مجتبیٰ سمجھ لیا تھا۔ میں نے بھی کچھ نہیں کہا، کیونکہ جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو حقیقت معلوم ہو گئی تو ان کے گرد غیر ضروری ہجوم جمع ہو جائے گا اور وہ اس سے سخت تکلیف محسوس کریں گے۔ اسی لمحے حاج آقا دوسری طرف سے آ گئے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا، مسکرائے، گویا کہنا چاہتے ہوں: "اب تم پھنس گئے ہو!" اور اوپر وارڈ کی طرف چلے گئے۔

گھر کے کام

اگر حاج آقا کے پاس وقت ہوتا تو وہ گھر کے تقریباً تمام کام خود انجام دیتے تھے۔ یہاں تک کہ خاندان میں یہ بات ایک دلچسپ مثال بن گئی تھی! حالانکہ وہ ایک عالمِ دین تھے، پھر بھی بچوں کا سامان خود اٹھاتے، کالسکے کو جھلاتے، بچوں کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے؛ مختصر آیہ کہ گھر کے ہر کام میں شریک رہتے تھے۔ میری اہلیہ اکثر مجھ سے کہا کرتی: "دیکھو! وہ رہبر کے فرزند ہیں، مجتہد ہیں، درسِ خارج بھی دیتے ہیں، پھر بھی اپنے بچوں کے کام کرتے ہیں، اور تم نے آج تک ایک مرتبہ بھی اپنے بچوں کے کاموں کو ہاتھ نہیں لگایا!" واقعی ان کے طرزِ عمل میں تکبر، برتری کے احساس یا خود نمائی کا ذرہ برابر شائبہ بھی نہیں تھا۔ مثلاً خاندانی اجتماعات میں بڑی کیتلی کے پاس خود بیٹھ کر سب کے لیے چائے تیار کرتے۔ پھر چائے کی ٹرے اٹھا کر خود سب کو پیش کرتے۔ جہاں تک نامحرم کا معاملہ نہ ہوتا، وہ ٹرے کسی اور کے حوالے نہیں کرتے تھے، بلکہ خود ہی ہر ایک کو چائے پیش کرتے۔ چائے کے بعد استعمال شدہ پیالے بھی خود جمع کرتے اور انہیں دھو دیتے تھے۔

یہ واقعہ بھی بیان کر دوں تاکہ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو واضح ہو جائے۔ جب بمباری کے بعد انہیں ملبے کے نیچے سے زخمی حالت میں نکالا گیا تو انہوں نے فرمایا: "میں یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک میری اہلیہ کی حالت معلوم نہ ہو جائے۔" آخر کار صرف اس بنا پر کہ دوبارہ بمباری کا خطرہ تھا اور سیکیورٹی کے تقاضے بھی موجود تھے، انہیں اصرار کے ساتھ وہاں سے منتقل کیا گیا۔

اپنی آنکھیں اپنی ماں کے قدموں پر رکھو

حاج آقا مجتبیٰ عبادت اور ذاتی زندگی میں اپنے لیے نہایت سخت اصول مقرر کرتے تھے، لیکن ان اصولوں کو کبھی اپنے اہلِ خانہ پر مسلط نہیں کرتے تھے۔ ان کی ذاتی ریاضت اور سختی کا اثر کسی بھی صورت میں گھر والوں پر نہیں پڑتا تھا۔ مثال کے طور پر ان کی بیٹی اسکول میں فٹبال کھیلا کرتی تھی۔ جب گھر یا خاندانی ماحول میں سب محرم ہوتے، تو وہ پوری آزادی کے ساتھ شوق سے فٹبال

کھیلتی تھی۔ یعنی وہ اپنے بچوں کو اس حد تک آزادی دیتے تھے۔ خود وہ راتوں کو عبادت کرتے، تہجد پڑھتے اور کثرت سے نفلی روزے رکھتے، لیکن کبھی اپنے اہلِ خانہ کو ان اعمال کا پابند نہیں بناتے تھے۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے کہ بچے حتی الامکان اس حقیقت کو محسوس نہ کریں کہ ان کے دادار ہبرِ معظم انقلاب ہیں اور اس نسبت کا کیا مفہوم ہے۔

جناب سید مجتبیٰ کا اپنے بچوں کے ساتھ تعلق نہایت دوستانہ تھا۔ میں نے خاص طور پر ان کے صاحبزادے کے بارے میں دیکھا کہ اگر کوئی اہم دینی یا تربیتی نکتہ سمجھانا ہوتا تو اسے آہستہ آہستہ، تدریج کے ساتھ اور انتہائی لطیف انداز میں منتقل کرتے، تاکہ کہیں سختی یا دباؤ کا احساس نہ ہو۔ مجموعی طور پر ان کا دینی طرزِ تربیت نہایت نرم، متوازن اور تدریجی تھا، اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو جس نے مجھے بہت متاثر کیا، وہ ان کا دینی ادب تھا۔

اگر حاج آقا کے پاس وقت ہوتا تو وہ گھر کے تقریباً تمام کام خود انجام دیتے تھے۔ مثلاً خود کیتلی کے پاس بیٹھ کر سب کے لیے چائے تیار کرتے، اور چائے پینے کے بعد استعمال شدہ پیالے بھی اپنے ہاتھ سے دھو دیتے تھے۔

ایک مرتبہ میری والدہ کی سالگرہ کی تقریب تھی اور حاج آقا بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا: "کیا تم چاہتے ہو کہ آج کی اس محفل میں سب سے بہترین عمل انجام دو؟" میں نے عرض کیا: "جی، ضرور!" انہوں نے فرمایا: "اپنی آنکھیں اپنی ماں کے قدموں پر رکھ دو۔"

"چشم قربان!"

وہ غیر معمولی انداز میں حضرت آقا (شہید رہبر) کی ذات میں محو تھے۔ حضرت آقا کے بارے میں ان کا رویہ ایک خاص تعبد اور عقیدت پر مبنی تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ حضرت آقا کے سامنے ہاتھ سینے پر رکھ کر کھڑے ہوئے اور عرض کیا: "چشم قربان!" حضرت آقا نے فرمایا: "اس طرح نہ کیا کرو۔" آقا سید مجتبیٰ نے عرض کیا: "میرا عقیدہ اور میرا نکتہ نظر یہی ہے۔"

وہ اپنی والدہ سے بھی غیر معمولی افسانوی محبت رکھتے ہیں، ایسی محبت جسے بیان کرنا مشکل ہے۔ ان کی والدہ محترمہ اس وقت علیل ہیں۔ قریباً دو سال پہلے میں نے دیکھا کہ جناب مجتبیٰ بہت فکر مند اور پریشان ہیں۔ میں نے پوچھا: "حاج آقا! کیا ہوا ہے؟" انہوں نے فرمایا: "میری والدہ بیمار ہیں، میں بہت پریشان ہوں، بہت!" جب کبھی وہ ان کے گھر جاتے اور ایک بیمار انسان کی جس قدر خدمت کی ضرورت ہوتی، وہ تمام خدمات انجام دیتے۔ اگرچہ حضرت آقا کی صاحبزادیاں بھی زیادہ موجود رہتی تھیں، لیکن وہ خود بھی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے۔

میں چونکہ اپنی والدہ کے ساتھ کام کرتا ہوں، کبھی کبھی ہمارے درمیان اختلاف بھی ہو جاتا ہے۔ میری بہن زہرا کہا کرتی تھیں: "آقا مجتبیٰ کا اپنی والدہ کے ساتھ تعبد، ادب، محبت اور شفقت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کا تصور بھی مشکل ہے۔" وہ اپنی والدہ کے ہاتھ اور قدم چومتے تھے، اور اگر والدہ کسی بات پر ناراض ہوتیں تو اس وقت تک مجلس نہیں چھوڑتے تھے جب تک ناراضی کی وجہ معلوم نہ کر لیتے۔ یہ بات زہرا نے مجھے نصیحت کے طور پر کہی تھی!

شہید رہبر کی اہلیہ بھی نہایت مظلوم اور قابلِ احترام خاتون ہیں۔ وہ حضرت آقا سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، اس زندگی کے ساتھ پوری طرح وابستہ تھیں اور انہوں نے اس طرزِ زندگی کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ انہیں ہمیشہ حضرت آقا کی فکر رہتی تھی۔ دونوں کے درمیان بہت بے تکلف اور قلبی تعلق تھا۔ ایک مرتبہ میرے والد حضرت

آقا کے گھر مدعو تھے۔ حضرت آقا نے فرمایا تھا: "فرید کو بھی ساتھ لے آنا۔" چنانچہ اس مجلس میں میں، آقا مجتبیٰ، ڈاکٹر حداد عادل اور خود حضرت آقا موجود تھے۔ کھانے کے وقت دسترخوان پر کھانا کم تھا۔ حضرت آقا نے فرمایا: "معذرت چاہتا ہوں، میں بھول گیا تھا کہ مہمان بھی مدعو ہیں۔ کھانا تقریباً ڈھائی افراد کے لیے ہے، اسی میں گزارا کر لیتے ہیں۔" جناب سید مجتبیٰ کسی جگہ سے مزید کھانا لے آئے۔ حضرت آقا نے فرمایا: "ضرورت نہیں تھی، ہم اسی میں گزارا کر لیتے۔" اس کے بعد گفتگو ہوئی کہ جب گھر کے مرد اچانک مہمان لے آئیں اور پہلے اطلاع نہ دیں تو خواتین کو کتنی زحمت ہوتی ہے۔ حضرت آقا نے فرمایا: "ہماری زندگی کے ایک دور میں ایسے واقعات پیش آتے تھے۔" پھر فرمایا: "ہم نے یہ طے کیا تھا کہ جب بھی کھانا پکائیں، اگر گھر میں چھ افراد ہوں تو آٹھ افراد کے حساب سے پکائیں، تاکہ اگر کوئی مہمان آ جائے تو کھانا موجود ہو۔ اسی وجہ سے اکثر کھانے کے وقت ہمارے پاس پچھلے دن کا کھانا بھی موجود ہوتا تھا، اور اس کا فائدہ یہ تھا کہ اچانک آنے والے مہمانوں کی وجہ سے مشکل پیش نہیں آتی تھی۔ گھر والے بھی اس معمول کے عادی ہو گئے تھے اور انہیں ناگواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔" حاج خانم نے بھی جدوجہد اور مبارزے کے میدان میں ہمیشہ حضرت آقا کا مضبوطی سے ساتھ دیا۔ وہ پوری استقامت کے ساتھ ان کے شانہ بشانہ کھڑی رہیں۔ حضرت آقا کا اپنی اہلیہ کے خاندان کے ساتھ تعلق بھی اپنے خاندان سے کم نہیں تھا۔ خصوصاً حاج محمد آقای خجستہ (شہید رہبر کے سسر محترم) کے ساتھ انہیں بہت انس اور خوشی محسوس ہوتی تھی۔

ایک مرتبہ میری والدہ کی سالگرہ کی تقریب تھی اور حاج آقا بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا: "کیا تم چاہتے ہو کہ آج کی اس محفل میں سب سے بہترین عمل انجام دو؟" میں نے عرض کیا: "جی، ضرور!" انہوں نے فرمایا: "اپنی آنکھیں اپنی ماں کے قدموں پر رکھ دو۔"

بچوں کے دوست

جناب سید مجتبیٰ بچوں کے ساتھ بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور ان سے بے تکلف دوستی قائم کر لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم کھڑے تھے کہ ہمارے خاندان کی ایک خاتون اپنے ننھے بچے کو گود میں اٹھائے اندر آئیں۔ ہم سب نے بہت کوشش کی، مختلف انداز سے اسے ہنسانا چاہا، مگر کامیاب نہ ہوئے۔ جب میں نے بچے کو گود میں لیا تو وہ رونے لگا۔ حاج آقا مسکراتے ہوئے بولے: "دیکھا! یہ معصوم ہے اور سب کچھ سمجھتا ہے، اس نے تمہیں پہچان لیا ہے!" میں نے کہا: "آپ گود میں لیں گے؟" فرمایا: "تم جانتے ہو، جب میں کسی بچے کو گود میں لیتا ہوں تو وہ فوراً میرا دوست بن جاتا ہے۔" میں نے کہا: "تو پھر لیجیے!" انہوں نے فرمایا: "نہیں، ابھی نہیں لیتا۔" دعوت کے دوران وہ ایک دو مرتبہ اس بچے کی طرف متوجہ ہوئے، لیکن بچہ پھر بھی نہ ہنسا۔ پھر انہوں نے کہا: "دیکھنا، مجھ سے بھی اور حضرت آقا سے بھی بچوں کا تعلق بہت اچھا ہوتا ہے۔ آخر کار میں اسے ضرور ہنسا دوں گا۔" آخر میں انہوں نے بچے کو اس کے والدین کی گود سے لیا، چند لمحوں میں اسے ہنسا دیا، پھر ہنستے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولے: "اب کیا چاہتے ہو؟ دوبارہ اسے گود میں لے کر رُلانا ہے؟"

ایک اور مرتبہ خاندانی محفل میں ایک نوجوان نے اپنی والدہ سے ناراضی کے انداز میں کہا: "آپ ہر بات پر ٹوکتی رہتی ہیں! میں یہ کام نہیں کرنا چاہتا!" میں نے دیکھا کہ حاج آقا اس نوجوان کو آہستہ سے ایک طرف لے گئے اور نہایت محبت سے فرمایا: "یہ تمہارا اور تمہاری والدہ کا معاملہ ہے، میں اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا۔

لیکن اگر تم کسی کام کو انجام نہیں دینا چاہتے تو بھی اپنی ماں سے سخت اور تلخ لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی بات نہ ماننا ایک گناہ ہے، لیکن انہیں تلخ جواب دینا بہت ہی بری بات ہے۔"

حضرت آقا (شہید رہبر) کی قبا

دسمبر ۲۰۲۴ میں ہمیں حضرت آقا کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ واپسی کے راستے میں میں نے اپنے والد سے کہا: "کیا آپ نے حضرت آقا کے لباس کی آستینوں کو دیکھا؟ ان کے سرے گھس چکے تھے۔ یہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت آقا اسی لباس میں کیمرے کے سامنے آ جائیں۔" میرے والد نے فرمایا: "آقای حجازی اور دفتر کے دوسرے حضرات اس معاملے کا خیال رکھتے ہیں۔" پھر والد صاحب نے ایک واقعہ سنایا: "فرید! گزشتہ ہفتے پیر کے دن میری آقای حجازی سے ملاقات تھی۔ ہم دونوں نے حضرت آقا کے ساتھ نماز ادا کی۔ نماز کے دوران میری نظر پڑی کہ جراب سے حضرت آقا کی ایڑی نظر آ رہی تھی، کیونکہ ان کی جراب کئی جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ آٹھ رکعت نماز کے اختتام تک میرا ذہن اسی جراب میں اٹکا رہا۔ جب نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ آقای ناطق میرے برابر میں کھڑے رو رہے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا: 'کیا تم نے حضرت آقا کی جراب دیکھی ہے؟ ہم کہاں ہیں اور وہ کہاں ہیں!'"

چار پانچ دن بعد میں نے جناب سید مجتبیٰ سے عرض کی: "اگر اجازت ہو تو ایک بات عرض کروں؟" میں نے پورا واقعہ بیان کیا اور کہا: "میں جانتا ہوں کہ حضرت آقا خود یہی پسند کرتے ہیں، لیکن کم از کم ان کے لیے اچھے معیار کی ایرانی جراب خرید لیجیے تاکہ اتنی جلدی خراب نہ ہوں۔" میری بہن ہماری گفتگو سن رہی تھیں۔ وہ مسکرا دیں۔ اس مسکراہٹ کا مطلب یہ تھا کہ میں ابھی پوری حقیقت سے واقف نہیں۔ انہوں نے کہا: "حضرت آقا کسی کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ جراب پہننے میں ان کی مدد کرے۔ چونکہ انہیں ایک ہاتھ سے خود ہی جراب پہننا پڑتی ہے، اس لیے وہ اسے زور سے کھینچتے ہیں، اور اسی وجہ سے اس کا کپڑا آہستہ آہستہ خراب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ نئی جراب لینے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔"

سادگی اور زاہدانہ زندگی میں حاج آقا مجتبیٰ بھی حضرت آقا سے بہت مشابہ ہیں۔ ایک مرتبہ ہم ان کے گھر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا: "مجھے ایک نشست میں جانا ہے۔" میں نے دیکھا کہ جب وہ اپنی قبا پہن کر اس کے بٹن بند کر رہے تھے تو انہیں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ میں نے کہا: "شاید بٹن کچھ نیچے لگا ہوا ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے فرمایا: "مجھے معلوم ہے!" میری تجسس کی کیفیت برقرار نہ رہ سکی، میں نے پوچھ لیا: "کیا اس لباس میں کوئی خرابی ہے؟" انہوں نے فرمایا: "نہیں، کوئی مسئلہ نہیں۔" پھر خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے زہرا سے کہا: "یہ قبا کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے، جیسے صحیح نہ سلی گئی ہو۔ حاج آقا بٹن بند کرنے میں بہت مشکل محسوس کر رہے تھے۔" انہوں نے کہا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا بٹن مختلف انداز سے لگایا گیا ہے۔ ہمارے عام کپڑے دائیں ہاتھ سے کام کرنے والے افراد کے مطابق سلے جاتے ہیں، لیکن یہ قبا حضرت آقا کی ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا: "پھر وہ حضرت آقا کی قبا کیوں پہنتے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا: "حضرت آقا اپنے کپڑے اس قدر استعمال کرتے ہیں کہ ان کی آستینیں گھس جاتی ہیں اور کبھی کبھی پھٹ بھی جاتی ہیں، پھر وہ انہیں رفو کروانا چاہتے ہیں۔ ایسے میں آقا مجتبیٰ اصرار کرتے ہیں کہ آپ یہ لباس ملاقاتوں میں نہ پہنیں، یہ مناسب نہیں لگے گا، یہ مجھے دے دیجیے۔ بڑی منت سماجت کے بعد وہ حضرت آقا کے پرانے لباس اپنے لیے لے

لیتے ہیں تاکہ حضرت آقا نئے کپڑے سلوانے پر آمادہ ہو جائیں، اور پھر خود انہی استعمال شدہ لباسوں کو پہنتے ہیں۔"

وہ واقعی انتہائی سادہ زندگی گزارتے ہیں، بے حد سادہ۔ ایک سفر سے ہماری والدہ دو جیکٹیں لائی تھیں؛ ایک میرے لیے اور ایک ان کے لیے۔ میں اس عرصے میں کئی جیکٹیں تبدیل کر چکا ہوں، لیکن وہ آج بھی وہی پہلی جیکٹ استعمال کر رہے ہیں۔

مجھے یاد ہے، کئی سال پہلے ایک محفل میں وہ چند افراد کے سامنے آیت اللہ مشکینی کے فضائل بیان کر رہے تھے، کیونکہ انہیں ان سے بہت عقیدت تھی۔ انہوں نے فرمایا: "ایک مرتبہ حضرت آقا کی آیت اللہ مشکینی سے ملاقات تھی۔ ملاقات کے اختتام پر حضرت آقا انہیں رخصت کرنے باہر تشریف لائے اور پوچھا: 'آیت اللہ مشکینی کے جوتے کون سے ہیں؟' پھر انہوں نے وہ جوتے اٹھائے، دیکھا کہ بہت پرانے ہو چکے ہیں، اور فرمایا: 'بچو! آیت اللہ مشکینی کے لیے ایک نیا جوڑا جوتا لے آؤ۔" یہ واقعہ سننے کے بعد میں نے جناب سید مجتبیٰ کے اپنے پرانے جوتوں کی طرف دیکھ کر کہا: "اب تو آپ کے جوتے بھی آیت اللہ مشکینی کے جوتوں جیسے ہو گئے ہیں، انہیں بدل دیجیے۔" وہ مسکرا کر بولے: "ابھی ان میں کوئی خرابی نہیں۔ ذرا پالش کر دوں گا تو بالکل نئے لگیں گے۔"

> حاج آقا مجتبیٰ عبادت اور ذاتی زندگی میں اپنے لیے نہایت سخت اصول مقرر کرتے تھے، لیکن ان اصولوں کو کبھی اپنے اہلِ خانہ پر مسلط نہیں کرتے تھے۔

دستاویزی فلم جو کبھی نہ بن سکی

بڑا دشوار ہوتا ہے کہ لوگ آپ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہوں اور آپ کو اپنی صفائی پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہو۔ میں ان سے کہتا رہا: "مخملباف (معروف فلمساز) کو یہ موقع نہ دیجیے کہ وہ آپ پر تہمتیں لگائے اور ایسی فلم بنائے جو پروپیگنڈا کرے کہ فلاں نے اپنے بچوں کی پیدائش برطانیہ میں کرائی ہے۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں رسالت ہسپتال پر ایک دستاویزی فلم بناؤں اور ثابت کروں کہ آپ کے بچوں کی پیدائش وہاں ہوئی ہے۔" انہوں نے یہ بات قبول نہ کی اور صرف فرمایا: "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ہمیشہ اپنی شخصیت کو رہبری کے منصب کے تابع رکھتے تھے۔ اس بات کا غیر معمولی اہتمام کرتے تھے کہ ان کی گفتگو یا طرزِ عمل میں نفس کی خواہش یا خود نمائی کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو۔ لوگ انہیں مختلف کاموں کی تجاویز دیا کرتے، لیکن وہ اکثر انکار کر دیتے؛ مثلاً عوامی خطابات قبول نہیں کرتے تھے، اسی طرح کسی بڑی مسجد کی باگ دوڑ نیز دو تین دینی مدارس بھی تھے جن کی اپنی مخصوص علمی خصوصیات تھیں، لیکن وہ اس بات کا سختی سے دھیان رکھتے تھے کہ کوئی بھی انہیں "آقا مجتبیٰ کا مدرسہ" نہ کہے۔ اسی احتیاط کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان کے خطابات اور بیانات کا منظم ذخیرہ بہت کم دستیاب ہے۔ میں اپنی بہن سے پوچھتا تھا: "وہ اس قدر احتیاط کیوں کرتے ہیں؟" وہ جواب دیتیں: "وہ نہیں چاہتے کہ ان کے نفس کو شہرت یا تعریف کی رغبت پیدا ہو۔"

ان کے فقہی دروس کو بعض طلبہ نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا، لیکن انہیں مرتب اور مدون کرنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری وجہ سے ان اسباق کی تدوین کا کام انجام پایا، مگر اس کے باوجود انہوں نے انہیں شائع کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ مجلسِ خبرگان کے اجلاس کے موقع پر کہا گیا کہ ولیِ فقیہ کے لیے جامع الشرائط مجتہد ہونا ضروری ہے۔ اس موضوع کی وضاحت کے لیے آقای جزائری نے بہت محنت کی، ایک دو کتابچے تیار کیے،

تقریباً سو نسخے شائع کیے اور اراکینِ خبر گان تک پہنچائے۔ بعد میں میں نے ان کے شاگردوں سے کہا: "اگر آپ لوگوں نے پہلے ہی یہ کام کیا ہوتا تو آج یہ صورت حال پیش نہ آتی۔" جواب می انہوں نے کہا: "حاج آقا مجتبیٰ خود اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔" ان کی پوری زندگی پردہ داری اور گمنامی میں گزری۔ وہ صحیح معنوں میں اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ مثلاً اپنے ایک پیغام میں انہوں نے ٹیکسی سے متعلق جو واقعہ بیان کیا، میرا خیال ہے اس سے پہلے کسی شخص کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔

دفتر کے حساب کتاب میں غیر معمولی احتیاط

وہ کبھی بھی مالی معاملات کو اپنی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔ مثلاً میرا بیٹا اور ان کا بیٹا ہم عمر ہیں، اس لیے ان کی آپس میں بہت گہری دوستی ہے۔ ایک مرتبہ دونوں کہیں اکٹھے گئے ہوئے تھے۔ میں نے حفاظتی ٹیم کے سربراہ سے کہا: "اگر ممکن ہو تو ہمارے یحییٰ کو گھر چھوڑ دیجیے گا، پھر دفتر تشریف لے جانا۔" انہوں نے فوراً جواب دیا: "جی ضرور، آقا فرید!" کچھ دنوں بعد میری بہن نے مجھ سے کہا: "فرید! معاف کرنا، آئندہ ایسا نہ کیا کریں۔" میں بولا: "ٹھیک ہے، میں آپ کی مجبوری سمجھتا ہوں، لیکن اُس دن واقعی میری مجبوری تھی۔" بہن نے کہا: "حاج آقا مجتبیٰ نے بعد میں بیٹھ کر اس راستے کا انٹرنیٹ ٹیکسی کا کرایہ معلوم کیا اور اپنی جیب سے ادا کیا تھا۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ میرے یا آپ کے بچوں کی وجہ سے انہیں اس زحمت میں نہ پڑنا پڑے۔"

ایک مرتبہ نوروز کی شام ہمارے ایک دوست نے دو ڈبے مٹھائی بھیجے اور کہلوایا کہ ان میں سے ایک حاج آقا مجتبیٰ کے لیے ہے۔ انہوں نے فرمایا: "میں یہ قبول نہیں کر سکتا، کیونکہ بھیجنے والے کو نہیں جانتا۔" ہمارا ایک ساتھی ہر سال ہمارے لیے شہتوت بھیجا کرتا تھا۔ اس کے بھیجے ہوئے شہتوت وہ قبول کر لیتے تھے، کیونکہ فرماتے تھے: "میں اسے جانتا ہوں، یہ اپنے شرعی مالی حقوق ادا کرتا ہے۔" ایک مرتبہ میرے والد کے ایک دوست کچھ کھانے پینے کی چیزیں بطور تحفہ لائے۔ انہوں نے والد صاحب سے پوچھا: "ان کا کاروبار کیسا ہے؟" والد بولے: "مجھے معلوم نہیں۔" پھر پوچھا: "کیا وہ شرعی مالی حقوق ادا کرتے ہیں؟" والد صاحب نے پھر کہا: "مجھے معلوم نہیں۔" میں دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے اس تحفے میں سے کچھ تو اٹھایا، لیکن اسے تناول نہیں کیا۔

ایک مرتبہ محض لحاظ اور مروّت کی بنا پر ہمیں کسی کے ہاں افطار میں جانا پڑا۔ ابتدا میں انہوں نے معذرت کی، مگر ہمارے بہت اصرار پر تشریف لے گئے۔ وہ وہاں بھی خاصے بے آرام تھے، کیونکہ میزبان کا گھر بہت پُرتعیش تھا۔ بعد میں بہن زہرا نے بتایا: "اسی رات انہوں نے حساب لگایا کہ کتنی مالیت کا کھانا کھایا ہے، پھر اتنی ہی رقم بطورِ ردِّ مظالم ادا کر دی۔"

مختصراً یہ کہ وہ حلال و حرام کے معاملے میں انتہائی محتاط تھے۔ ایک مرتبہ میری بہن کی بیماری کی وجہ سے انہیں اپنے مہمانوں کے لیے دفتر کے باورچی خانے سے دس افراد کے لیے چاول اور سالن منگوانا پڑا۔ بعد میں وہ خود گئے، کھانے کی قیمت معلوم کی اور اسی وقت پوری رقم ادا کر دی۔

آدابِ گفتگو

وہ لوگوں کو نہایت سختی کے ساتھ دوسروں کی نجی زندگی میں مداخلت سے روکتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے دوسری شادی کی، جس کے باعث اس کی پہلی اہلیہ سے اختلافات پیدا ہو گئے، اور یہ معاملہ خاندان بھر میں زیرِ بحث آ گیا۔ خاندان کی خواتین بھی اس موضوع پر گفتگو کرنے لگیں، لیکن انہوں نے اس بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بعد میں جب ہم تنہا ہوئے تو میں نے ان سے کہا: "آپ تو بڑے زیرک ہیں، آپ نے کچھ نہیں کہا تاکہ

خواتین کو برا نہ لگے۔" انہوں نے فرمایا: "نہیں، حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہمیں تمام حقائق معلوم نہ ہوں اور ہم فیصلہ کرنے کے مقام پر نہ ہوں، ہمیں دوسروں کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ آخر ہم کیوں حق الناس کے مرتکب ہوں؟ اس شخص نے اچھا کیا یا برا، یہ اس کا اپنا معاملہ ہے۔" میں نے عرض کیا: "پھر حضرت آقا (شہید رہبر) نے کیوں فرمایا ہے کہ جو شخص دوسری شادی کرے، وہ میرے دفتر میں نہ رہے؟" انہوں نے جواب دیا: "یہ حکم اس فعل کے سماجی اور انتظامی اثرات کی وجہ سے ہے، نیز اس لیے بھی کہ دفترِ رہبری معاشرے کے لیے ایک نمونہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔"

حضرت آقا دوسری شادی اور عقدِ موقت کے معاملے میں بہت سخت مؤقف رکھتے تھے، اور جناب سید مجتبیٰ بھی اسی روش پر قائم ہیں۔ ایک صاحب، جو ان کے دفتر کے انتظامی امور انجام دیتے ہیں نے مجھے بتایا: "وہ اس معاملے میں اپنے والد سے بھی زیادہ سخت ہیں۔" انہوں نے واضح طور پر فرمایا تھا: "جو شخص دوسری شادی یا عقدِ موقت کرے، وہ پھر میرے دفتر میں نہ آئے۔" یہاں تک کہ وہ اس موضوع پر مذاق کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔

ان کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ گفتگو میں الفاظ اور اوصاف کی مقدار کے استعمال میں انتہائی دقیق اور محتاط تھے۔ مثلاً وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے: "یہ بہت برا آدمی ہے۔" بلکہ یوں کہتے: "یہ شخص اس پہلو سے ایک مشکل میں مبتلا ہے۔" یا: "اس نے اس معاملے میں غلطی کی ہے۔"

ان کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ گفتگو میں الفاظ اور اوصاف کی مقدار کے استعمال میں انتہائی دقیق اور محتاط تھے۔ مثلاً وہ کبھی یہ نہیں کہتے تھے: "یہ بہت برا آدمی ہے۔" بلکہ یوں کہتے: "یہ شخص اس پہلو سے ایک مشکل میں مبتلا ہے۔" یا: "اس نے اس معاملے میں غلطی کی ہے۔"

وہ ہمیشہ گفتگو میں ایسے الفاظ اختیار کرتے تھے جو حقیقت کے عین مطابق ہوں، اور کسی کے بارے میں مبالغہ آمیز یا غیر منصفانہ تعبیر استعمال کرنے سے سخت اجتناب کرتے تھے۔

بے خبری میں اقتدا، پشیمانی

وہ شدت سے اہلِ عبادت تھے اور بڑی مفصل نماز ادا کرتے تھے۔ اگر آپ بے خبری میں ان اقتدا کریں تو یقیناً پشیمان ہوں گے۔ ایک مرتبہ میں ان کے گھر گیا۔ دیکھا کہ وہ نماز ادا کر رہے ہیں۔ میں نے فوراً ان کی اقتدا کر لی۔ نماز ختم ہونے میں تقریباً بیس منٹ نکل گئے۔ اس دوران جتنی روحانی اور غیر روحانی یادیں میرے ذہن میں تھیں، سب ایک ایک کر کے تازہ ہو گئیں۔ جو بھی ذکر مجھے یاد تھا، سب پڑھ ڈالا یہاں تک کہ نماز ختم ہوئی! نماز کے بعد انہوں نے فرمایا: "آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ یہاں موجود ہیں؟" میں نے عرض کیا: "میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ کبھی آپ کی اقتدا نہیں کروں گا!" وہ مسکرا کر بولے: "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ نے میری اقتدا کی ہے تو میں نماز مختصر پڑھتا۔" ایک مرتبہ ہم کہیں جا رہے تھے اور ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ انہوں نے کہا: "اجازت دیجیے، میں اپنی ایک نماز ادا کر لوں۔" نماز مکمل ہونے کے بعد میں نے کہا: "کچھ دیر ہو گئی ہے۔" انہوں نے کہا: "نمازِ اول وقت کا کسی چیز سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو۔" یہی کیفیت وقت گزرنے کے ساتھ حضرت آقا (شہید رہبر) میں بھی دن بہ دن زیادہ نمایاں ہوتی گئی تھی اور جناب سید مجتبیٰ بھی ایسے ہی ہیں۔

ہم کئی برس تک اپنے والد کے گھر کی نچلی منزل میں رہتے تھے۔ ایک رات ہمارے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے جانے کے بعد ہم اپنے فلیٹ میں آ گئے، جبکہ جناب سید مجتبیٰ ہمارے والد کے گھر ہی رک گئے تھے اور مجھے اس کا علم نہ تھا۔ میرا موبائل والد صاحب کے ڈرائنگ روم میں رہ گیا تھا۔ فجر کی اذان سے پہلے میں اسے لینے اوپر گیا۔ اندھیرے میں جیسے ہی کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا، اچانک کسی چیز سے زور سے ٹکرایا۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ حاج آقا سجدے میں ہیں۔ میں کچھ گھبرا گیا۔ انہوں نے مختصر سی نگاہ میری طرف ڈالی، پھر دوبارہ عبادت میں مشغول ہو گئے، وہ عبادت میں غرق تھے۔

وہ قرآن حفظ کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں، لیکن قرآن میں تدبر اور غور و فکر پر اس سے بھی زیادہ تاکید کرتے ہیں۔ خود حافظِ قرآن نہیں ہیں، لیکن قرآن کے ساتھ بہت زیادہ مانوس ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا: "آؤ، اسکول کے کاموں کے بارے میں آپس میں بات کرتے ہیں۔" پھر وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "جو مسلمان قرآن کے ساتھ مانوس نہ ہو، وہ حقیقی مسلمان نہیں ہے۔ آپ کے ادارے میں قرآن کے حوالے سے کتنا کام ہوتا ہے؟ بچوں کو مسلسل قرآن پڑھنا چاہیے اور اس کے ساتھ مانوس رہنا چاہیے۔ "وہ قرآن کو بہت گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ جب کوئی قرآن پڑھتا ہے تو وہ آسانی سے بتا دیتے ہیں کہ اس کا معنی اور مفہوم یہ ہے۔

جیبی قرآنِ مجید

وہ بہت زیادہ قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں۔ ایک سفر میں ہم ساتھ تھے، میں مشاہدہ کرتا رہا جب انہیں کوئی خاص کام نہ ہوتا تو وہ اپنا قرآن کھول لیتے، دو صفحات تلاوت کرتے، نشان آگے منتقل کرتے اور پھر اسے بند کر دیتے۔ ان کے پاس ایک مخصوص قرآنِ کریم ہے جو کبھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ وہ قرآن کے ساتھ اُنس اور مانوسیت پیدا کرنے پر بہت زیادہ تاکید کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے سوال کیا کہ اگر ہمیں قرآن پڑھنے کا وقت نہ مل سکے تو کیا کریں؟ فرمایا: "اپنے آپ کو قرآن کی مسلسل تلاوت کا عادی بنانا چاہیے، لیکن اگر ایسا نہ کر سکو تو کم از کم سورۂ یٰسین کو اس طرح سورۂ الرحمٰن کو اس انداز سے سورۂ مُلک کو پڑھنے کی عادت ڈالو اور ان آیات کو نماز میں اس طرح پڑھا کرو۔"

> انہوں نے بہت سے صاحبِ معرفت افراد سے ملاقات کر رکھی تھی اور بعض کا امتحان بھی لیا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کا روحانی اتصال کس حد تک ہے۔

سال کے چھ ماہ

حاج آقا بہت سخت زندگی گزارتے تھے اور اپنے اوپر کافی سختی کرتے تھے۔ سال کے چھ ماہ روزے رکھتے تھے۔ آخری مرتبہ جب ہم نے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا تو انہوں نے فون کر کے بلایا تھا کہ تشریف لے آئیے۔ حفاظتی ٹیم تبدیل ہو گئی تھی اور وہ کافی سختی کر رہے تھے۔ خیابانِ کشور دوست والے دروازے سے لے کر ان کی خدمت میں پہنچنے تک تقریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ انہوں نے فرمایا: "آپ سے ملنے کا دل کر رہا تھا۔" ہم نے بھی کہا: "ہمارا دل بھی آپ کے لیے اداس ہو رہا تھا۔" میں نے کہا: "کیا بات ہے، آج آپ روزے سے نہیں ہیں!" یہ سن کر وہ مسکرا دیے۔ وہیں میں نے پوچھا: "آپ کے خیال میں جنگ ہو گی؟" فرمایا: "جب تک آقا کو شہید کرنے کے قابل نہ ہو جائیں، جنگ نہیں ہو گی۔"

عصرِ عاشورا

ان کی عزاداری کی کیفیت خاص ہوتی ہے۔ ایک عصرِ عاشورا ہم ان کے ساتھ تھے، میں نے دیکھا کہ وہ بہت افسردہ ہیں۔ میں نے پوچھا: "کیا کوئی بات ہوئی ہے؟" فرمایا: "اہلِ بیت علیہم السلام کا اصل غم یہاں سے شروع ہوتا ہے۔" کچھ دیر بعد وہ اٹھے اور چلے گئے، اور ہم اس دن پھر ان سے ملاقات نہ کر سکے۔ وہ بہت زیادہ اہل ذکر ہیں۔ وہ اذکارِ ماثورہ میں سے خالص اور بہترین اذکار تلاش کرتے ہیں اور ان پر پابندی کے ساتھ مداومت فرماتے ہیں۔

اہلِ معرفت

آیت اللہ بہجتؒ کی جانب سے انہیں جو نصیحتیں دی جاتی تھیں، ان کی تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے بہت سے صاحبِ معرفت افراد کو دیکھا تھا اور بعض کا امتحان بھی لیا تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کا روحانی اتصال کس حد تک ہے۔ ایک مرتبہ گھر میں ایک زندہ شخصیت کا ذکر ہوا اور سب لوگ ان کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہے ہیں، ایسی مسکراہٹ جیسے کہہ رہے ہوں: اب میں کیا کہوں۔ جب تنہائی ہوئی تو میں نے پوچھا: آپ نے فلاں شخص کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا؟ انہوں نے کہا: مراقب رہیں کہ لوگ بلاوجہ کسی کے مرید نہ بن جائیں؛ کبھی کبھی اس کے ناقابلِ تلافی نتائج نکلتے ہیں۔

حضرت آقا (شہید رہبر) بھی بہت سے اہل معرفت افراد سے رابطہ رکھتے تھے اور وہ سب ان کی زندگی کے حالات سے واقف تھے کہ آگے کیا پیش آسکتا ہے۔ مشہد میں ایک شخص تھے جنہیں آقای نور کہا جاتا تھا۔ میں نے اصرار کر کے آقا سے پوچھا کہ آقای نور کا معاملہ کیا تھا؟ فرمایا: اس شرط پر بتاؤں گا کہ زیادہ سوال نہیں کرو گے۔ وہ ایک شخص تھے جو کسی حد تک عالمِ روحانیت سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۹۷۴ء یا ۷۵ میں انہوں نے مجھ سے کہا: اے آقا سید علی! تم بہت سختیاں برداشت کرو گے، لیکن بلند مقام تک پہنچو گے۔ میں نے پوچھا: یعنی مرجعِ تقلید بنوں گا؟ انہوں نے کہا: نہیں، دنیاوی اعتبار سے بلند مقام تک پہنچو گے۔ میں نے کہا: یعنی مثلاً وزیرِ اعظم بنوں گا؟ انہوں نے کہا: ملک کی سب سے بڑی شخصیت بنو گے۔ تمہارے ساتھ ایک برا واقعہ پیش آئے گا، لیکن اگر تم اس حادثے سے بچ گئے تو ملک کے سب سے بڑے منصب تک پہنچو گے۔ آقا فرماتے تھے: میں نے اس شخص سے کہا: آپ کا بھی واقعاً بڑا حوصلہ ہے! اس وقت ہماری درسگاہ بند کر دی گئی ہے، مسجد بند کر دی گئی ہے اور ساواک مسلسل ہمیں طلب کر کے تفتیش اور جیل کے لیے لے جا رہی ہے، اور تم کہتے ہو کہ میں شاہ بنوں گا؟! اس نے کہا: ہاں، ممکن ہے شاہ بن جاؤ!

ایک بات بطورِ ضمنی عرض کروں۔ میرے والد نے نقل کیا تھا کہ ایک مرتبہ آقا نے نمازِ جمعہ میں دعا کی تھی: خدایا! ایسا کر کہ میرے چہرے کے بال میرے سر کے خون سے رنگین ہو جائیں۔ میں نے کسی ایسے شخص سے پوچھا جس نے آقا کا چہرہ دیکھا تھا، اس نے کہا: ایسا ہی تھا۔

جناب مجتبیٰ بھی مشہد میں بعض اہلِ معنا کو جانتے تھے اور قم و اصفہان میں بھی کچھ افراد سے ارتباط رکھتے تھے۔ اصفہان میں ایک شخصیت ہیں جنہیں آقای ناصری کہا جاتا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ شیخ جعفر کے بھائی ہیں۔ ہمارے ماموں چند ماہ قبل وفات پا گئے ہیں۔ میں نے آقای ناصری سے پوچھا: حاج آقا! میرے ماموں کی کیفیت کیسی ہے؟ انہوں نے فرمایا: وہ اولیائے خدا میں سے ہیں۔ میں نے کہا: ہمارے ماموں تو بہت معمولی انسان تھے! انہوں نے فرمایا: ان کی روح بہت آزاد تھی؛ تمہارے ماموں میں کیا خصوصیت تھی؟ میں نے کہا: وہ مجذور تھے۔ فرمایا: شاید یہی وجہ ہو۔ پھر میں

نے پوچھا: حاج آقا مجتبیٰ کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: اسلام کا مستقبل ہیں؛ انتظار کرو، تم خود دیکھ لو گے۔

استاد کا حق

حاج آقا حوزوی علم و دانش کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور اپنے اساتذہ کے احترام و تعظیم کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ان کی موجودگی میں ایک عالمِ دین پر تنقید کی تو انہوں نے فرمایا: "اس عالم کے بارے میں نازیبا بات نہ کہو! یہ میرے استاد ہیں اور ان کا حقِ استادی ادا کرنا میرے لیے ضروری ہے۔ میرے استاد کے بارے میں میرے سامنے کوئی نامناسب بات نہ کہیں۔"

مطالعہ کا وسیع دائرہ

جناب سید کی بھی حضرت آقا کی طرح صرف ادبیات سے وابستگی نہیں ہے، فلم و ہنر سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ وہ جدید علوم اور فنون پر گہری دسترس رکھتے ہیں۔ جدید مالیاتی مباحث سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اسٹارٹ اپس کے میدان میں بھی ان کی معلومات بہت مضبوط ہیں اور وہ اس شعبے کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی بحث کے دوران ایک شخص نے ایک ایسے صاحب کا نام لیا جو بظاہر مالیاتی خواندگی سے متعلق اسٹارٹ اپس کے میدان میں نمایاں افراد میں شمار ہوتے تھے۔ اس پر حاج آقا نے فرمایا: "میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" زراعت اور پانی کے مسائل کے میدان میں بھی ان کی یہی کیفیت ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: "اگر ملک کو خود مختار بننا ہے تو اس کی زراعت کو مضبوط اور قائم رہنا چاہیے۔" شاید اس نوعیت کی معلومات اور علوم کی یہ وسعت، حضرت آقا کے بنیادی مسائل اور افکار کے وسیع دائرے سے مسلسل وابستگی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

ایک مرتبہ میں سپاہ کے ایک جنرل کے ساتھ محرومیت زدائی کے ایک ادارے میں گیا تھا۔ اس جنرل کے ساتھ کام کرنے والے ایک شخص نے بتایا: "ہم نے پانی اور کم پانی استعمال کرنے والی صنعتوں کے موضوع پر بہت کام کیا ہے۔" وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے اپنے تمام کاموں کی رپورٹ آقا مجتبیٰ کو پیش کی ہے۔ خلاصہ یہ کہ جناب مجتبیٰ جدید مالیاتی علوم، مالی معاونت کے فنڈز، سونے کے فنڈز وغیرہ کے بارے میں نہایت دقیق معلومات رکھتے ہیں۔ ان کا علمی مقام معاصر علمی سرحدوں کو چھوتا ہے! ایک دور میں انہوں نے ثقافتی صنعتوں کے موضوع پر ایک مفصل منصوبے پر کام کیا۔ اس سلسلے میں شاید دو تین ہزار صفحات کا مطالعہ کیا۔ میری بہن کہتی تھیں کہ انہوں نے اس موضوع سے متعلق تمام فارسی متون کا مطالعہ کیا تھا اور بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بھی کروا کر پڑھا تھا۔

> وہ بعض سیاسی گروہوں سے واقعۂ ۲۰۰۹ (فتنہ ۸۸) کی شرانگیزیوں کے معاملے میں بہت ناراض تھے۔ ان کی ناراضی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ان لوگوں نے آقا (رہبر) کے پیش کردہ اسلامیت اور جمہوریت کے باہمی تعلق کے تصور کو مجروح کیا ہے۔

انہوں نے نفسیات کا بھی کافی مطالعہ کیا ہے، اگرچہ مجھے اس کی دلیل معلوم نہیں ہے۔ ان کا فہم اور گہرائی صرف نفسیات کے مطالعے تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں آگے ہے۔ ہمارے درمیان کام کے میدان میں کوئی خاص تعلق نہیں تھا، لیکن کبھی کبھی وہ مشاورت، نفسیاتی تجزیے اور ذہنی گاہی کے علوم سے متعلق بعض طریقوں کو استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خاندان کا ایک نوجوان پریشان تھا اور میں اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ جب وہ نوجوان ایک لمحے کے لیے باہر گیا تو حاج آقا مجتبیٰ نے مجھ سے فرمایا:

"آقا فرید! اسے حقیقتاً گلے لگاؤ۔" پھر انہوں نے بتایا کہ آغوش کے کتنے اہم اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح فرماتے تھے: "اس کا ہاتھ تھامو؛ اس کا یہ اثر ہوتا ہے۔" وہ بہت اچھی طرح سنتے ہیں؛ بالکل ایک ماہرِ مشیر کی طرح۔ مشاورت کے بعض طریقوں پر بھی انہیں اچھی دسترس ہے اور دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔

ایک زمانے میں میں نے ہائیڈروپونک (آبی زراعت) کاشت کاری کے موضوع پر تحقیق کی۔ تقریباً پندرہ منٹ تک بڑے جوش و خروش سے انہیں اس کے بارے میں بتاتا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ کبھی کبھی ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آتی اور پھر ختم ہو جاتی۔ جب میری گفتگو مکمل ہوئی تو انہوں نے فرمایا: "یہ بات بھی سنی ہے؟" میں نے کہا: جی ہاں، یہ بتانا بھول گیا تھا۔ پھر میں نے کہا: آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ یہ سب جانتے ہیں؟ فرمایا: "میں نے سوچا شاید آپ کے پاس کوئی نئی بات ہو۔ فلاں جگہ فلاں شخص کے فارم پر جائیں، جو کچھ آپ بیان کر رہے ہیں وہ سب وہاں پہلے ہی انجام دیا جا چکا ہے۔" حاج آقا نے ذرائع ابلاغ کے موضوع پر بھی میری بہن سے چند کتابیں لے کر مطالعہ کی تھیں۔

ڈاکٹر حداد عادل کے ساتھ علمی مباحثہ

ایک مرتبہ میرے والد صاحب کے ساتھ اسلامی علوم کی تاریخ کے موضوع پر ان کی گفتگو ہوئی، جو نہایت دلچسپ تھی۔ ایک بار اخباری مکتبِ فکر کے موضوع پر بھی ان کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اسی طرح ایک موقع پر حافظ شیرازی کے اشعار کے مختلف پہلوؤں پر بھی باہم تبادلۂ خیال کیا۔

ایک روز یہی شعری گفتگو حضرت آقا کی موجودگی میں ہوئی۔ حضرت آقا نے فرمایا: انسان اپنی زندگی کے دوران ایسے اشعار بھی کہہ سکتا ہے جن میں دنیاوی رنگ غالب ہو، اور ایسے اشعار بھی کہہ سکتا ہے جو بہت بلند، روحانی اور عرفانی مفاہیم کے حامل ہوں۔

حضرت آقا نے فرمایا: شاعر رھی معیری اچھے شاعروں میں سے تھے۔ ان کی ایک غزل ہے جس میں ایک ملکوتی اور آسمانی شخصیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے... کیا آپ نے وہ غزل سنی ہے؟ پھر فرمایا: یہ شاعر پہلی مرتبہ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہوائی جہاز پر سوار ہوا اور ایک فضائی میزبان سے متاثر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے آسمان، پرواز اور بلندیوں کے مضامین کو اپنی شاعری میں بیان کیا۔ جو شخص اس پس منظر سے واقف نہ ہو، وہ سمجھے گا کہ شاعر سرو سلوک، معرفت اور روحانی حقائق کے بارے میں شعر کہہ رہا ہے، حالانکہ خود رھی معیری نے بتایا ہے کہ یہ اشعار انہوں نے فلاں فضائی میزبان (ایئر ہوسٹس) کے لیے کہے تھے۔

میرے والد صاحب کا ابتدائی خیال یہ تھا کہ حضرت آقا صرف فلسفے سے عمومی واقفیت رکھتے ہیں۔ لیکن جب وہ چند سال تک دائرۃ المعارف اسلامی مرکز کے اجرائی مدیر رہے تو یہ تصور بدل گیا۔ ہر سال ماہِ مبارک رمضان میں مرکز کے اراکینِ مجلس نظما حضرت آقا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ملاقات سے پہلے ایک نشست ہوتی جس میں یہ طے کیا جاتا کہ حضرت آقا کے سامنے کون سے موضوعات پیش کیے جائیں گے، اور اسی مناسبت سے تصویری اور تحریری رپورٹس تیار کی جاتی تھیں۔ ایک مرتبہ میرے والد صاحب اور حاج طارمی صاحب آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ میرے والد صاحب نے کہا: خیال رکھیے کہ فلاں صاحب حضرت آقا کے سامنے بہت زیادہ فلسفیانہ مباحث نہ چھیڑ دیں؛ کیونکہ حضرت آقا سوالات کرتے ہیں، اور اگر ہم نے کوئی بات غلط بیان کر دی تو وہ اس کی تفصیل پوچھتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف وقت زیادہ لگے گا بلکہ ہماری علمی حیثیت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہ الفاظ میرے اپنے ہیں، لیکن مجھے یاد ہے کہ والد صاحب کا کہنا تھا کہ حضرت آقا فلسفیانہ مباحث میں گہری اور سنجیدہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

پسندیدہ کتاب

انہوں نے امام خمینیؒ کی کتاب « چالیس حدیث » بہت شوق اور اہتمام کے ساتھ پڑھی تھی۔ کتاب پڑھنے والوں کی کتابوں میں سے آپ کو ایسی کتاب تلاش کرنی ہوتی ہے جس کے صفحات بہت زیادہ استعمال ہونے کی وجہ سے گھِس گئے ہوں۔ کتاب « چالیس حدیث » جناب سید مجتبیٰ کی انہی کتابوں میں سے ایک تھی؛ انہوں نے اسے خوب پڑھا تھا اور اس میں نشان دہی اور لکیر کشی بھی کی تھی۔ انہوں نے شہید مطہری کی تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہوا تھا اور آقای مصباح کی کتابیں بھی پڑھ رکھی تھیں۔ ان کی اہم کتابیں میں نے ان کی ذاتی لائبریری میں دیکھی تھیں۔

حاج قاسم سے عقیدت

وہ سید حسن نصراللہ سے بہت محبت رکھتے تھے اور ان کے ساتھ ان کا رابطہ بھی تھا۔ اس رابطے کی مقدار کا مجھے علم نہیں، لیکن اس کی کیفیت بہت بلند تھی۔ یہاں تک کہ دونوں کے درمیان بعض نہایت خاص روحانی و معنوی موضوعات پر گفتگو بھی ہوتی تھی؛ ایک دو مرتبہ ایسا واقعہ پیش آنے کا پتا ہے۔ حاج قاسم سے بھی انہیں خصوصی عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ وہ کہہ رہے تھے: اگر آقا اجازت دے دیں تو میں حاج قاسم کے حکم پر جانے کے لیے تیار ہوں، چاہے شام، لبنان یا عراق ہی کیوں نہ جانا پڑے اور وہاں کوئی کام انجام دینا پڑے؛ کیونکہ میں ان کے کام کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔

وہ بعض سیاسی گروہوں سے واقعۂ ۲۰۰۹ (فتنہ ۸۸) کی شرانگیزیوں کے معاملے میں بہت ناراض تھے۔ ان کی ناراضی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ ان لوگوں نے آقا (رہبر) کے پیش کردہ اسلامیت اور جمہوریت کے باہمی تعلق کے تصور کو مجروح کیا ہے۔ ہمارے پاس ایک سربلند اسلامی جمہوری نظام تھا کہ جس میں تمام صدر مملکت باری باری آئے اور اپنی ذمہ داریاں انجام دے کر رخصت ہوئے تھے، لیکن ان لوگوں نے آکر اس عمل کو نقصان پہنچایا۔

جنگی امور میں مہارت

نظامی معاملات میں ان کا کردار نمایاں تھا۔ ایک مرتبہ اتوار کے دن میرا ارادہ تھا کہ آقا سے ملاقات کے لیے جاؤں۔ جناب سید مجتبیٰ نے فرمایا: اتوار کو نہ آئیں، کیونکہ یہ دن فوجی ملاقاتوں کا دن ہے اور ماحول بھی فوجی نوعیت کا ہوتا ہے۔ آقا بھی اس دن وہ نرم شخصیت نہیں ہوتے جو آپ دوسرے دنوں میں دیکھتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ ہماری ایک فوجی کمانڈر سے شناسائی ہوئی اور ہم ان کے ساتھ کچھ معاملات انجام دے رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد حاج آقا نے میرے کام کے بارے میں پوچھا۔ میں نے عرض کیا: میں فلاں صاحب کے ساتھ یہ کام آگے بڑھا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا: احتیاط کیجیے، ان صاحب کے بارے میں چند سال پہلے ایک حفاظتی معاملہ پیش آیا تھا؛ مجھے معلوم نہیں کہ وہ حق پر تھے یا غلطی پر، لیکن بہرحال محتاط رہیں! وہ لوگوں کو بہت باریکیوں اور تفصیلات کے ساتھ جانتے تھے۔

> آقا نے کئی مرتبہ مختلف مقامات پر فرمایا تھا کہ آقا مجتبیٰ صرف آقازادہ نہیں ہیں بلکہ وہ خود بھی آقا ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ ان کا شہید جنرل سلامی اور جنرل فدوی کے ساتھ بھی بہت قریبی رابطہ تھا۔ فوجی امور کے کچھ پہلو ایسے ہوتے ہیں جو ظاہر نہیں ہوتے، لیکن بہت اہم ہوتے ہیں؛ مثلاً اعلیٰ رتبہ کمانڈروں کے درمیان اختلافات کو دور کرنا۔ ان میں سے بعض معاملات میں حاج آقا مجتبیٰ بھی داخل ہوتے، اپنی رائے دیتے اور حضرت آقا کی مدد کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں گیا۔ جب ہم بیٹھے تو انہوں نے پوچھا: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جو عمارت سے باہر گیا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، کوئی باہر نہیں گیا۔ انہوں نے کہا: یاد ہے ایک بار میں نے کہا تھا کہ ایک سکیورٹی افسر ہے جس نے اسرائیل کے بارے میں بہت کام کیا ہے؟ وہ آپ سے پہلے یہاں موجود تھا۔ میں صرف یہ اطمئنان چاہتا تھا کہ آپ نے اسے نہ دیکھا ہو تاکہ میں اس کے بارے میں بات کر سکوں۔ یعنی فوجی افراد کے ساتھ اس نوعیت کے خصوصی روابط بھی رکھتے تھے۔

آقا کے مددگار

حضرت آقا، سید مجتبیٰ کو بڑے اور اہم منصوبے سونپتے تھے۔ مثال کے طور پر اعلیٰ حکام کے درمیان اختلافات کے حل، مزاحمتی اقتصاد کے معاملات، فوجی کمانڈروں کے ساتھ روابط اور اسی نوعیت کے دیگر امور ان کے سپرد کیے جاتے تھے۔ حفاظتی، عسکری اور سیاسی مسائل میں وہ تقریباً ۲۵ سال تک حضرت آقا کے مددگار کے طور پر رہے۔

جون ۱۹۹۷ء سے جناب مجتبیٰ کو سیاسی نوعیت کی ذمہ داریاں بھی سونپی گئیں۔ میں نے سنا تھا کہ جنرل فدوی نے کہا تھا: ایک مرتبہ حاج آقا مجتبیٰ نے ہمیں ایک بات فرمائی جس میں عملیاتی حکم کا مفہوم تھا۔ ہمیں تردد ہوا کہ اگر ہم اس پر عمل کریں تو شاید بعد میں کوئی اعتراض کرے۔ چنانچہ ہم حضرت آقا کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت آقا نے فرمایا: آقا مجتبیٰ کی بات میری بات ہے۔ حضرت آقا نے مختلف مواقع پر کئی مرتبہ فرمایا تھا کہ: آقا مجتبیٰ صرف آقازادہ نہیں ہیں، بلکہ خود آقا ہیں۔

اپنے دل کے ساتھ قرآن پڑھو!
استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

بعض امور ہماری روح پر گہرا اثر ڈالتے ہیں؛ مثلاً معانی اور الفاظ، جیسے قرآن کی آیات اور دعائیں جن کی آپ تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض جسمانی کیفیات بھی اثرانداز ہوتی ہیں، مثلاً خشوع و خضوع کے ساتھ بیٹھنا۔ اسی طرح قلبی احساسات اور دل کی کیفیت (جذبات) بھی اہم ہیں، جنہیں انسان کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔

قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت کوشش کریں کہ اپنے قلبی احساسات کو بیدار کریں۔ مثال کے طور پر جب اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب سے متعلق آیات کی تلاوت کریں تو دل میں اس کے مناسب کیفیت اور موقف پیدا کریں۔ توکل، شوق، رجاء اور اس جیسے دیگر مفاہیم سب قلبی احساسات ہیں۔

مثال کے طور پر ایک شخص رستم و سہراب کا قصہ پڑھتا ہے تو دوسرا اس سے متاثر ہو کر رونے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جذبہ اور احساس پیدا ہونا، روحانیت کے حصول میں مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے ہدایت کی گئی ہے کہ جنت اور جہنم سے متعلق آیات کی تلاوت کرتے وقت انسان مناسب قلبی کیفیت اور احساس اپنے اندر پیدا کرے۔

مثلاً جب ہم اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں: ﴿إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا﴾ تو شیطان کو کمزور سمجھنا اور اسے حقیر جاننا خود ایک مطلوب کیفیت ہے۔

۲۳ اکتوبر ۲۰۱۷ء

۱۹۸۶ء سے جناب سید مجتبیٰ کے ساتھ ہم مباحثہ رہے

حجۃ الاسلام حسین سعیدیان

انٹرویو



آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے ساتھ چالیس سالہ رفاقت کی روداد

خط: آپ کی جناب سید مجتبیٰ خامنہ ای سے آشنائی کا آغاز کیسے ہوا؟

۱۹۸۶ء سے میری اور حاج آقا مجتبیٰ خامنہ ای کی تقریباً ہم مباحثہ ہونے کی رفاقت رہی۔ ہم نے «مغنی»، «مطوّل» اور «سیوطی» سے لے کر آیاتِ عظام وحید خراسانی، تبریزی اور زنجانی کے درسِ خارج تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی۔ کتاب «رسائل» ہم آیت اللہ احمدی میانجی کے پاس پڑھتے تھے۔ میں، حاج آقا مجتبیٰ اور ان کے بڑے بھائی حاج آقا مصطفی، تینوں ان کے شاگرد تھے۔ قم کے مدرسۂ سعادت میں آیت اللہ احمدی میانجی ہمارے حجرے میں آکر درس دیتے تھے۔ «مکاسب» کے بابِ بیع کو ہم نے آقای استادی سے پڑھا، جبکہ «کفایۃ الاُصول» کا ایک حصہ آقای سید حسن طاہری خرم آبادی (رکنِ مجلسِ خبرگان) سے اور دوسرا حصہ آیت اللہ مؤمن کے برادر محترم سے پڑھا۔ تہران میں بھی ہم آیت اللہ مجتہدی کے مدرسے میں زیرِ تعلیم رہے اور میرزا ابوالقاسم فلسفی، آقای ضیاء آبادی اور آیت اللہ رؤوفی جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اسی زمانے میں منطق کی معروف کتاب «جوھر النضید» بھی ہم نے پڑھی اور اس کا باہمی مباحثہ کیا۔

میری حاج آقا مجتبیٰ کے ساتھ نہایت قریبی دوستی تھی اور ہمارے تعلقات انتہائی گہرے تھے۔ ۱۹۸۶ء اور ۱۹۸۷ء میں محاذِ جنگ پر بھی ہم ساتھ رہے۔ بعض اوقات حاج آقا مجتبیٰ اپنی گاڑی میں مجھے لینے آتے تاکہ ہفتے کے آخر میں ہم دونوں ایک ساتھ تہران واپس جائیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ حضرت آقا (رہبر شہید) کے دورِ صدارت میں، جب ہم مشہد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، تو میں، حاج آقا مجتبیٰ اور حاج آقا مصطفی ایک ہی کمرے میں قیام کرتے تھے۔ حضرت آقا (رہبر شہید) کی شخصیت نہایت منظم تھی۔ ان کی پوری زندگی نظم و ضبط اور منصوبہ بندی پر قائم تھی، اور وہ ہمیں بھی ہمیشہ نصیحت کرتے تھے کہ اپنے اوقات کے لیے باقاعدہ پروگرام بناؤ تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔ اسی لیے وہ ہمارے روزانہ کے معمولات کا بھی جائزہ لیتے تھے اور فرماتے تھے: "صبح سے شام تک جو کچھ کرتے ہو، اسے لکھا کرو۔" ہم اپنی روزانہ کی سرگرمیاں لکھتے اور حضرت آقا انہیں دیکھتے تھے۔ مجموعی طور پر امامِ شہید کا پورا خاندان، خصوصاً ان کے فرزندان، نہایت خوش اخلاق، باوقار اور ہر قسم کی حاشیہ آرائی سے دور تھا۔ میں نے حاج

آقا مجتبیٰ سے کبھی کوئی نامناسب یا خلافِ شرع بات نہیں دیکھی۔ وہ پاکیزہ فطرت، دیندار اور ہر معاملے میں نہایت محتاط انسان تھے۔ یہاں تک کہ گفتگو میں بھی پوری احتیاط کرتے تھے کہ ان کی زبان سے کوئی لغو یا بے فائدہ بات نہ نکلے۔

خط: آپ کا روزانہ کا معمول اور منصوبہ بندی کیسی ہوتی تھی؟

ہم عموماً اذانِ فجر سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہو جاتے تھے۔ بیدار ہونے کے بعد حجرے میں مل کر ورزش کرتے۔ پھر ناشتے کی تیاری ہوتی؛ مثال کے طور پر میں پیدل صفائیہ چوک تک جا کر روٹی لے آتا، پھر واپس آکر ہم سب مل کر ناشتہ کرتے۔ صبح چھ بجے سے ساڑھے سات بجے تک باقاعدہ درس و مطالعہ کرتے، اور اس کے بعد دن بھر کے کاموں کے لیے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آگے بڑھتے۔ پھر مسجدِ اعظم میں دروس میں شرکت کے لیے جاتے۔ واپسی پر دوبارہ مطالعہ اور مباحثہ شروع ہو جاتا۔ عموماً ظہر سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے کچھ دیر آرام یا مختصر قیلولہ کرتے تاکہ عصر کے اوقات کے لیے تازہ دم رہیں۔

> حضرت آقا (رہبر شہید) ہماری روزانہ کی منصوبہ بندی پر بھی نظر رکھتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: "صبح سے شام تک جو کچھ کرتے ہو، اسے لکھا کرو۔" ہم اپنا روزانہ کا معمول تحریر کرتے، پھر حضرت آقا اسے دیکھتے اور اس کا جائزہ لیتے۔

چند سال مدرسۂ سعادت اور ہمارا حجرہ آیت اللہ جوادی آملی کی نگرانی میں رہا۔ وہ نہایت شفقت اور باریک بینی کے ساتھ ہماری علمی سرگرمیوں پر توجہ دیتے تھے، اور ہم بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا کہ ہمیں علامہ کی «شرحِ تجرید» ضرور پڑھنی چاہیے، چنانچہ اسی مقصد کے لیے انہوں نے خود ہمارے لیے ایک استاد بھی مقرر کیا۔ یہ درس میں، آقا مجتبیٰ اور آقا مصطفی تینوں مل کر پڑھتے تھے۔ اگر مجھے درست یاد ہے تو ہمارے استاد جناب آقای رحمانی تھے، جو آیت اللہ جوادی آملی اور آیت اللہ حسن زادہ آملی کے شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں ہم آیت اللہ جوادی آملی کے درسِ تفسیر کے بعض حصے بھی باہم پڑھتے تھے۔ اسی طرح فلسفے کی کتابیں «بدایۃ الحکمۃ» اور «نہایۃ الحکمۃ» بھی زیرِ مطالعہ رہیں، اور مجھے یاد ہے کہ حاج ملا ہادی سبزواری کی «منظومہ» کے کچھ حصوں کا بھی ہم نے باہمی مباحثہ کیا۔ میرے سسر مرحوم آیت اللہ شاہ آبادی فلسفے کے ماہر تھے، اسی وجہ سے میں نے خاص طور پر ان کی رہنمائی میں فلسفے کا مزید مطالعہ کیا، اگرچہ آقا مجتبیٰ بھی اس میدان میں اچھی خاصی علمی دلچسپی اور مطالعہ رکھتے تھے۔

خط: جیسا آپ بتا رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ منصوبہ بندی اور وقت کی قدر کے بہت زیادہ پابند تھے؟

بلاشبہ، نظم و ضبط اور سنجیدگی، جناب سید مجتبیٰ اور حضرت آقا کے دیگر فرزندان کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔ آقا مجتبیٰ مطالعے کے بے حد شوقین ہیں اور ان کی عادت ہے کہ سونے سے پہلے ضرور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے ہیں۔ یہ عادت دراصل ان کے والدِ محترم کی کتاب دوستی اور مطالعے سے گہری دلچسپی کا ہی تسلسل ہے۔

جناب سید مجتبیٰ ایک منظم، علمی ذوق رکھنے والے اور ہمیشہ درس و مطالعے میں مشغول رہنے والی شخصیت ہیں۔ وہ پوری کوشش کرتے تھے کہ ان کا ایک لمحہ بھی بے مقصد ضائع نہ ہو۔ اسی لیے وہ غیر ضروری اور حاشیہ آرائی پر مبنی امور، مثلاً بے بنیاد سیاسی گفتگو، غیبت یا تہمت سے سخت اجتناب کرتے تھے۔ میں نے نہ آقا مجتبیٰ میں اور نہ ہی آقا مصطفی میں کبھی ایسا طرزِ عمل دیکھا، بلکہ وہ دوسروں کو بھی اس قسم کی گفتگو کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تعطیل کے دنوں کے لیے بھی ان کے پاس باقاعدہ منصوبہ ہوتا

تھا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا کہ چھٹی کے بہانے اپنا وقت بے ترتیبی یا بے مقصد مصروفیات میں گزار دیں۔

خط: درس کے علاوہ ان کی دیگر مصروفیات کیا تھیں؟

جناب سید مجتبیٰ کو مصری قرّاء سے غیر معمولی شغف تھا۔ کبھی ہم حجرے میں بیٹھتے اور عبدالباسط عبدالصمد، محمد صدیق منشاوی اور مصطفیٰ اسماعیل کی تلاوت کی آڈیو ریکارڈنگز سنتے تھے۔ مجھے بھی بچپن ہی سے قرآنِ کریم سے خاص انس تھا۔ اگرچہ ہمارے گھر میں نہ ریڈیو تھا اور نہ ٹیلی ویژن، لیکن میری والدہ مکۂ مکرمہ سے ایک ٹیپ ریکارڈر لائی تھیں، جس پر میں قرآنِ کریم کی تلاوت سنا کرتا تھا۔

ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ہماری صحت مند تفریحات بھی ہوتی تھیں؛ مثلاً احباب کی دعوتوں میں شرکت، باہمی مزاح اور دوستانہ گفتگو۔ البتہ میں نے کبھی آقا مجتبیٰ سے کوئی خلافِ شرع عمل، بے مقصد گفتگو یا کسی کی توہین نہیں دیکھی۔ میرا خیال ہے کہ ان کی شخصیت کی بنیادی ساخت ہی ایسی ہے۔ حضرت آقا کا پورا خاندان نہایت باادب، منظم، خوش تربیت اور ہر قسم کی حاشیہ آرائی سے پاک ہے۔

> میں نے حاج آقا مجتبیٰ سے کبھی کوئی خلافِ شرع یا نامناسب بات نہیں دیکھی۔ وہ پاکیزہ سیرت، نہایت متدین اور ہر معاملے میں محتاط انسان تھے۔ یہاں تک کہ گفتگو کے دوران بھی پوری کوشش کرتے تھے کہ ان کی زبان سے کوئی لغو یا بے فائدہ بات نہ نکلے۔

ناولوں کا مطالعہ بھی آقا مجتبیٰ کی دلچسپیوں میں شامل تھا، اور یہ شوق انہیں اپنے والدِ شہید سے ورثے میں ملا تھا؛ یعنی انسانی معاشرے کی بعض حقیقتوں کو ادب کے ذریعے سمجھنے اور پہچاننے کے زاویے سے۔ اسی طرح استاد شہید مطہری کی تصنیفات بھی ان کی خصوصی دلچسپی کا مرکز تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہم ان کی کتابوں کا مشترکہ مطالعہ کرتے اور ان پر باہمی مباحثہ بھی کیا کرتے تھے۔

خط: امامِ شہید کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر اور ان کے ساتھ تعلق کیسا تھا؟ آخرکار یہ صرف باپ بیٹے کا نہیں بلکہ ولایت کا بھی رشتہ تھا۔

آقا مجتبیٰ اپنے والدِ محترم کے بارے میں نہایت حساس، باریک بین اور ذمہ دار تھے۔ وہ اپنے والد کے گرد و پیش کے ماحول اور ان کے اطراف کے افراد پر گہری نظر رکھتے تھے اور گویا ایک «عقلِ منفصل» کا کردار ادا کرتے تھے۔ امامِ شہید بھی آقا مجتبیٰ اور ان کی آراء کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان پر خاص اعتماد رکھتے تھے۔ مشہور تھا کہ امامِ شہید آقا مجتبیٰ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: "یہ صرف آقازادہ نہیں، بلکہ خود ایک آقا ہیں۔"

دوسری طرف، امامِ شہید کی اپنے فرزندان سے غیر معمولی محبت بھی نمایاں تھی، اور یہ بات ان کے قریبی افراد پر بھی واضح تھی۔ دورانِ جنگ امامِ شہید نے خاص طور پر تاکید فرمائی تھی: "مجتبیٰ شہید ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں، لیکن ہرگز اسیر نہیں ہونے چاہییں۔"

خط: دورانِ دفاعِ مقدس (آٹھ سالہ عراق کی مسلط کردہ جنگ) میں ان کی موجودگی سے متعلق کوئی یادگار واقعہ بیان فرمائیے۔

ایک روز میں، سید الشہداءؑ ڈویژن کے کمانڈر حاج علی فضلی، ان کے نائب حسین آقا پروین اور آقا مجتبیٰ چند افراد کے ساتھ حلبچہ جھیل کے قریب ایک راستے پر سفر کر رہے تھے۔ سڑک سنسان تھی اور ہماری گاڑی تنہا آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک ہم نے دیکھا چند عراقی ہیلی کاپٹر آسمان سے نیچے اتر آئے ہیں اور سیدھا ہماری گاڑی کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ اس لمحے ہمیں محسوس ہوا کہ شاید سفر کا اختتام یہی ہے۔ میں نے آقا مجتبیٰ کی طرف رخ

کر کے کہا: "آیئے کلمۂ شہادت پڑھ لیں؛ اگر انہوں نے حملہ کر دیا تو پھر معاملہ ختم ہے۔" ہم نے ذکر، استغفار اور دعا شروع کر دی: "اے اللہ! ہمیں معاف فرما..."

ہم پوری رفتار سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک ایمبولینس بھی ہمارے پیچھے تھی۔ وہ لوگ پیچھے کی طرف ہٹنے کی کوشش کر رہے تھے اور ہم بچنے کے لیے تیزی سے آگے جا رہے تھے۔ ہم ہر ممکن صورتِ حال کے لیے تیار تھے۔ چند لمحوں بعد، نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک ہیلی کاپٹروں نے اپنا رخ بدل لیا۔ انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور کسی دوسری سمت روانہ ہو گئے؛ شاید انہیں کوئی زیادہ اہم ہدف مل گیا تھا یا کوئی نیا حکم موصول ہوا تھا۔ مختصر آیہ کہ ہماری جان میں جان آئی، لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دور سے سات آٹھ جنگی طیارے نمودار ہوئے اور یکے بعد دیگرے حلبچہ پر اپنے کیمیائی بم گرانے لگے۔ لوگ ہماری آنکھوں کے سامنے زمین پر گرتے جا رہے تھے۔ اسی دن کے اثرات ہیں کہ آج تک کبھی کبھی مجھے کھانسی آجاتی ہے۔ میں نے کبھی کسی ڈاکٹر سے رجوع نہیں کیا کہ وہ یہ بتاتا کہ یہ کیمیائی حملے کا اثر ہے یا نہیں، لیکن اس دن کے نشانات آج بھی میرے وجود میں باقی ہیں۔

خط: کیا آپ یا حاج آقا مجتبیٰ بھی کبھی زخمی ہوئے؟

نہیں، صرف ایک مرتبہ راکٹ کے دھماکے سے ہم دونوں خاکریز کے دوسری جانب جا گرے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا؛ نہ کوئی گولی لگی، نہ کوئی شیل کا ٹکڑا، صرف ہاتھوں پر معمولی زخم آئے۔ اگرچہ بظاہر ان دنوں ہم کیمیائی حملے کا براہِ راست شکار نہیں ہوئے، لیکن حلبچہ میں ہماری موجودگی خود ایک الگ داستان ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ راکٹوں اور میزائلوں کے دھماکوں سے سفید اور گھنا دھواں آسمان کی طرف اٹھتا تھا۔ جب ہم حاج آقا مجتبیٰ کے ساتھ حلبچہ شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف دل دہلا دینے والے مناظر تھے۔ بے گناہ کرد شہری شہید ہو چکے تھے اور ان کی لاشیں گلیوں اور گھروں میں پڑی تھیں۔ ایک گھر میں دروازے کے قریب ایک بوڑھی خاتون ملی، جو کیمیائی گیس کے باعث نابینا ہو چکی تھیں، جبکہ ان کے گھر کے تمام افراد وہیں شہید پڑے تھے۔ یہ منظر انتہائی دردناک اور جان سوز تھا۔ ایک اور گھر میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی دکھائی دیں۔ ابتدا میں ہمیں گمان ہوا کہ وہ زندہ ہیں، مگر قریب جا کر معلوم ہوا کہ وہ بھی شہید ہو چکی ہیں۔ ان کی آغوش میں ایک شیر خوار بچہ تھا، گویا وہ چند لمحے پہلے اسے دودھ پلانے والی تھیں۔ ماں اور بچہ دونوں ایک ساتھ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ یہ ایسا منظر ہے جو عمر بھر انسان کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

صورتِ حال اس قدر المناک تھی کہ سڑکوں پر پڑی لاشیں گاڑیوں کے پہیوں تلے آ کر کچلی جا رہی تھیں۔ بعض ڈرائیوروں کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نیچے انسانی اجساد ہیں۔ ایک مقام پر ہم نے ایک شخص کی لاش دیکھی جو منہ کے بل گری ہوئی تھی، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چشمے پر جا کر اپنا چہرہ دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جناب سید مجتبیٰ ان تمام مشاہدات، حالات اور زمینی اطلاعات کو مسلسل ٹیلی فون کے ذریعے اپنے والدِ محترم تک پہنچاتے تھے۔

خط: جناب سید مجتبیٰ کی اہلِ معرفت سے ملاقات اور تعلق پر بہت کچھ سنا ہے۔ اگر اس حوالے سے کوئی نکتہ بیان فرمائیں؟

حاج آقا مجتبیٰ اہلِ معرفت کا بہت احترام کرتے تھے اور ان پر خاص توجہ دیتے تھے۔ مثلاً جناب بہاء الدینی، جناب مولوی اور جناب نور اُن شخصیات میں سے تھے جنہیں دیکھ کر واقعی محسوس ہوتا تھا کہ روحانیت اُن کے وجود میں جاری ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بعض اوقات خود حاج آقا مجتبیٰ ان کی زیارت کے لیے جانے اور ان کی خیریت دریافت کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ ان کے والدِ شہید بھی اسی طرح کا اہتمام رکھتے تھے۔

میرے پاس ایک آڈیو کیسٹ تھی جس میں آیت اللہ بہاء الدینی اور رہبرِ شہید انقلاب کی ملاقات ریکارڈ تھی۔ اس میں جناب خامنہ ای نے ان سے عرض کیا: آپ ہمیں کوئی نصیحت فرمائیں۔ آقای بہاء الدینی کا ایک خاص اندازِ گفتگو تھا۔ وہ اکثر فرماتے تھے: "جی آقا..." اور اس "جی" کو کھینچ کر ادا کرتے تھے، گویا اس میں جواب بھی ہوتا تھا، ادب بھی اور توجہ بھی۔ اسی گفتگو کے ایک حصے میں جناب بہاء الدینی نے جناب خامنہ ای سے فرمایا: ہم آپ کو ایک کامیاب انسان سمجھتے ہیں؛ آپ اہلِ تہجد ہیں۔ اللہ کرے آپ کی یہ توفیقات برقرار رہیں... اور آپ مزید توفیقات سے بہرہ مند ہوں۔ واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جناب بہاء الدینی عالمِ معنا میں — میرے تعبیر کے مطابق — امام کی مدد کرتے تھے۔ بعد ازاں جب جناب خامنہ ای رہبر بنے تو وہ ان کی بھی بہت مدد کرتے رہے۔

جناب بہاء الدینی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ متعدد بار انہیں حضرتؒ کی بارگاہ میں شرفِ حاضری نصیب ہوئی تھی۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کا دل روحانیت سے پوری طرح وابستہ تھا۔ حاج آقا مجتبیٰ بھی انہی وجوہات کی بنا پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور اکثر ان کی اقتدا میں نماز بھی ادا کرتے تھے۔

خط: والدین کی خدمت اور خاندانی پہلوؤں کے بارے میں ان کی زندگی میں کوئی بات قابلِ ذکر ہے؟

آقا مجتبیٰ کی زندگی میں ایثار، وفاداری اور خاندان کے لیے قربانی کی بہت سی مثالیں نظر آتی تھیں؛ یہاں تک کہ کبھی کبھی انسان محسوس کرتا تھا کہ یہ وہ آزمائشیں ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کے لیے مقرر فرماتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اگر والد یا والدہ کو معمولی سی بھی کوئی مشکل پیش آتی تو وہ فوراً ان کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ والدین کے ساتھ ان کی وابستگی اور خدمت کا اہتمام بہت گہرا اور مضبوط تھا؛ یہاں تک کہ وہ اپنی تعلیم اور ذمہ داریوں کو چھوڑ کر بھی والدین کی خدمت کے لیے حاضر ہونے کو تیار رہتے تھے۔ مجھے ان کی والدہ کی بیماری کا واقعہ یاد ہے۔ بظاہر وہ اپنے والد کی تنہائی دور کرنے کے لیے ان کے پاس آئے تھے۔ لیکن خود انہوں نے مجھے اپنے والد کی اپنے والد (یعنی آقا مجتبیٰ کے دادا) کے ساتھ خدمت اور ایثار کا واقعہ سنایا تھا۔ ان کے والد اپنے والد کے لیے، جن کی آنکھیں جب دیکھنے کے قابل نہیں رہی تھیں، گھنٹوں کتاب پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ یہ بات میں نے خود آقا مجتبیٰ اور آقا مصطفیٰ کی زبان سے سنی ہے۔ ان کے والد قم میں درس و بحث میں مشغول تھے، لیکن جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ ان کے والد کو ان کی خدمت اور ساتھ کی ضرورت ہے، انہوں نے درس چھوڑ دیا اور مشہد چلے گئے تاکہ اپنے والد کے پاس رہ سکیں۔ یہی وفاداری ان کے لیے خیر اور توفیق کا سبب بنی۔ آقا مجتبیٰ میں بھی بالکل یہی روحیات موجود تھیں۔ اگر ان کے والد کو کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ تمام کام چھوڑ کر ان کی عیادت اور ملاقات کے لیے چلے جاتے تھے۔ البتہ آقا مصطفیٰ بھی اسی طرح تھے، لیکن آقا مجتبیٰ میں، میں اس اہتمام اور خصوصی توجہ کو زیادہ نمایاں دیکھتا تھا۔

> **حاج آقا مجتبیٰ اپنے والد کے بارے میں نہایت حساس اور دقیق نظر رکھتے تھے۔ وہ اپنے والد کے گرد و پیش کے افراد اور ماحول پر نظر رکھتے تھے اور ایک «عقلِ منفصل» کا کردار ادا کرتے تھے۔**

آپ کا آنا ضروری ہے!: آیت اللہ بہجت

حجۃ الاسلام علی بہجت (فرزند آیت اللہ بہجت رح)

انٹرویو



حجۃ الاسلام والمسلمین علی بہجت (فرزندِ آیت اللہ العظمیٰ بہجت) کے ساتھ گفتگو میں، عارفِ نامدارِ زمانہ حضرت آیت اللہ العظمیٰ محمد تقی بہجت کے ساتھ آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی ملاقاتوں اور روابط کی یادیں

خط: ایران کے موجودہ حالات، حق اور کامل حقیقت کے ظہور کے زمانے سے قریب ہو چکے ہیں۔ آپ کے والد آیت اللہ بہجت اس دور کے بارے میں کچھ بتایا کرتے تھے؟

جواب: وہ زیادہ تر آخر الزمان کی سخت آزمائشوں اور امتِ اسلام کے امتحانات کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ سخت بلائیں اور آزمائشیں آنے والی ہیں اور دن بہ دن ان کی شدت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر انسان تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرتا ہے تو اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ وہ شیعوں کی حفاظت اور بقا کے لیے دعا کرے تاکہ وہ زمانۂ فرج تک محفوظ رہیں۔ کیونکہ جتنا ہم آگے بڑھیں گے، حملے بھی زیادہ ہوں گے، آزمائشیں بھی سخت تر ہوں گی، اور سب سے بڑھ کر عقیدے سے دوری اور اعتقادات سے فرار کے واقعات میں اضافہ ہوگا۔ اس زمانے میں توسل کرنا چاہیے تاکہ بلائیں اور آزمائشیں لوگوں کی طاقت سے زیادہ نہ ہوں اور شیعوں سے دور کر دی جائیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ تعجیلِ فرج کی مخصوص دعاؤں میں یہ بھی کہیں: «اللهم عجل لوليك الفرج بحق وليك حجة بن الحسن» یعنی اللہ تعالیٰ کو خود امامِ زمانہ (عج) کی قسم دے کر دعا کریں کہ نہ صرف حضرت کا فرج نزدیک ہو بلکہ شیعہ کا فرج بھی قریب ہو۔

خط: آپ نے اس زمانے کی سخت آزمائشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان امتحانات کو مزید واضح فرمائیں۔

جواب: ان دنوں عجیب و غریب آزمائشیں پیش آ رہی ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ (ع) کے زمانے میں ایک فرعون تھا، تو آج فرعون عالمی نوعیت کا ہے؛ وہ پوری دنیا کو آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتا ہے۔ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ سب ہی کہتے ہیں: یہ ہمارے طرف نہیں آیا، اور واقعات کے قریب سے آسانی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ بیدار رہنا چاہیے؛ خاص طور پر رات کے وقت، نصف شب اور اذان سے پہلے دعا اور توسل کے ذریعے۔ اذان سے پہلے کی گریہ و زاری اور تضرع بہت مؤثر ہوتی ہے؛ نہ صرف بلا کو دور کرنے میں، بلکہ اس کی شدت کم کرنے میں بھی، اور لوگوں میں اسے برداشت کرنے کی طاقت بڑھانے میں بھی۔ لوگوں کو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ: "میں ان نو کروڑ لوگوں کے درمیان کیا حیثیت رکھتا ہوں؟" نہیں؛ اگر سب مل کر استغفار اور تضرع کرنے والے بن جائیں تو دعائیں یقیناً مؤثر ہوں گی۔ اہلِ ایمان کا اجتماعی طور پر دعا اور توسل کرنا ایسی طاقت رکھتا ہے جو بلاؤں کو ٹالنے اور ان کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتی ہے۔

خط: ایسا لگتا ہے کہ ان قومی امتحانات میں سے ایک امتحان ہمارے رہبر کی شہادت اور آقا مجتبیٰ خامنہ ای کو انقلاب کا رہبر منتخب کیا جانا تھا۔ حقیقتاً خدا کا ہاتھ نظر آیا؛ دشمن کی دھمکیوں اور اقدامات کو دیکھتے ہوئے بھی اور لوگوں کی جانب سے ان کے لیے ظاہر کیے گئے اقبال کو دیکھتے ہوئے بھی۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

دشمن جو منصوبے بناتے ہیں، انہیں دیکھیں اور پھر دیکھیں کہ خداوند کس طرح ان منصوبوں کو ناکام بنا دیتا ہے۔ ان کے والد کو شہادت سے بہت محبت تھی اور آخر کار شہادت ہی ان کا مقدر بنی؛ وہ بھی «افسق الفساق» اور زمانے کے سب سے بڑے فرعون، بدترین خون خوار انسان کے ہاتھوں۔ یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ انسان ایسے شقی ترین لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو!

اس شقی شخص کی شقاوت پوری دنیا تک پہنچ چکی ہے۔ سب سمجھ گئے ہیں کہ اگر وہ ایران سے فارغ ہو جائے تو فرانس کو بھی گالیاں دے گا اور ان کی توہین کرے گا؛ وہ سب کو اپنے زیرِ تسلط لانا چاہتا ہے۔ اب خدا نے اسی دشمن کو اس مرد کی سعادت کا ذریعہ بنا دیا اور لوگوں نے بھی دیکھ لیا کہ ان کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا تھا، وہ حقیقت کے خلاف تھا۔ ان کے خلاف جتنا ماحول بنایا گیا تھا، اس کے باوجود لوگ واپس آ گئے۔

اپنے عزیز رہبر کے بارے میں بھی عرض کروں کہ مجھے یاد ہے، کئی سال تک ہم مرحوم علی صفائی کے ساتھ مقدمات پڑھتے تھے اور مدرسۂ فیضیہ میں تقریباً تمام طلبہ کو جانتے تھے۔ جو بھی طالب علم آتا، ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ کتنے سال پہلے قم آیا ہے، کیا پڑھتا ہے، کس طرح پڑھتا ہے اور کس کام میں مشغول ہے۔ اس زمانے میں طلبہ کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی اور ان کو پہچاننا ہمارے لیے ایک فطری بات تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اسی پہچان کے بارے میں ہم نے ایک مقابلہ بھی رکھا تھا اور میں جیت گیا تھا۔ اس وقت میں ابھی «مغنی» پڑھتا تھا اور وہ «سیوطی» پڑھ رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اسی طبقۂ طلبہ کے درمیان بڑے ہوئے اور اسی وجہ سے طلبہ کی علمی اور اخلاقی کیفیت کا اچھا تجربہ حاصل کیا۔ اسی تجربے کی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو میں جانتا تھا، ان میں آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای سے زیادہ مناسب اور بصیرت رکھنے والا کوئی شخص مجھے نظر نہیں آیا۔

خط: رہبرِ عزیز اور آیت اللہ بہجت کے درمیان تعلق اور ملاقاتوں کے بارے میں اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو بیان فرمایئے؟

ان کے درمیان باقاعدہ اور متعدد ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً ایک ملاقات میں جو آیت اللہ بہجت کے ساتھ ہوئی، انہوں نے سیاسی مسائل میں داخل ہونے، ان میں غور و فکر کرنے اور مطالعہ کرنے کے لیے میرے والد سے اجازت طلب کی۔ میرے والد، اگرچہ اس معاملے میں کسی کو اجازت دینے کا معمول نہیں رکھتے تھے، لیکن یہاں فوراً اور پوری صراحت کے ساتھ موافقت فرمائی۔ اس سے پہلے، مثلاً ایک شخص قوۂ قضائیہ کی سربراہی کے لیے آیا تھا، جس کے لیے حاج آقا نے اجازت نہیں دی تھی، اور اس طرح کے متعدد واقعات موجود تھے۔ میرے لیے سوال پیدا ہوا، میں نے ان سے اس فوری، قطعی اور مثبت جواب کی وجہ پوچھی۔ انہوں نے جواب دیا: ان کے لیے ان مسائل میں داخل ہونا ضروری ہے؛ انہیں والد کے ساتھ افراد کی شناخت کے میدان میں رہنا چاہیے تاکہ نفوذ اور رشوت کے راستے کو روکا جا سکے۔

آیت اللہ بہجت کے نزدیک نفوذ اور رشوت کا مسئلہ بہت اہم تھا، اور افراد کے بارے میں حساسیت کی وجہ بھی انہی دو پہلوؤں سے تھی۔ وہ بارہا پیغام دیتے تھے کہ نفوذ، رشوت اور اس جیسے امور کے سامنے رکاوٹ بنیں؛ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نقصان پہنچے گا۔ وہ بارہا تاکید کرتے تھے کہ خدا جانتا ہے کہ رشوت کیا کچھ کر دیتی ہے۔ میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں نے ان سے زیادہ بصیرت رکھنے والا اور آگاہ شخص نہیں دیکھا؛ کیونکہ رہبری میں افراد اور سماجی و سیاسی موضوعات کی شناخت ہر دوسری خصوصیت سے زیادہ اہم ہے۔

آج ہم ایسی حالت میں نہیں ہیں کہ آزمائش اور خطا کر سکیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں یا فلاں کو آزما لیتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ وہ کر سکتا

ہے یا نہیں۔ یہاں تجربہ کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ مسئلہ عقیدے کی مضبوطی اور حکم کی پختگی کا ہے؛ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ جیسے کسی طالب علم کو ایک مسجد سے دوسری مسجد منتقل کرنا ہو اور کہا جائے کہ دیکھتے ہیں یہ اچھا ہے یا وہ۔

اس وقت جنگ ہے، اگر کوئی شخص اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے آزمایا نہیں جاسکتا۔ یہ شیعہ مملکت ہے، [غلطی کی صورت میں] سب کچھ ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ [رہبر] ایسا شخص ہو جس کے پاس بصیرت بھی ہو اور آگاہی بھی۔ وہ اسی زمانے سے ان مسائل پر کام کر رہے تھے اور مجھے بھی ان کے کاموں کی خبر تھی۔ تمام افراد کے درمیان مجھے ان سے زیادہ اہل شخص نہیں ملا۔

یا ایک اور واقعہ [بیان کروں] جو خود آقا سید مجتبیٰ بیان کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے: ایک معاملے کے لیے آیت اللہ بہجت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنا سوال پیش کیا۔ جواب کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ ان کا مخاطب میں نہیں ہوں، بلکہ گویا وہ میرے والد سے گفتگو کر رہے ہیں، حالانکہ اس وقت میرے والد وہاں موجود نہیں تھے اور تہران تشریف رکھتے تھے۔

پھر جب میں تہران گیا تو والد سے کہا: «آقا، میں ان کی خدمت میں گیا تھا۔» انہوں نے کہا: «اچھا، انہوں نے...» میں نے کہا: «انہوں نے یہ بات فرمائی۔» والد نے کہا: واقعی انہوں نے یہ کہا؟ عجیب انسان ہیں! وہ قم میں بیٹھے ہوئے ہیں، میں ابھی سوچ بچار کر رہا ہوں اور معاملے کے مختلف پہلوؤں کو پرکھ رہا ہوں، جبکہ وہ مکمل آگاہی رکھتے ہیں!

خط: کیا اس مجلس کی مزید جزئیات آپ کو یاد ہیں؟

کچھ اور امور بھی تھے، لیکن ایک حصہ کرونا کی وجہ سے بھول گیا اور ایک حصہ خود والد صاحب کے تصرف کی وجہ سے تھا، کیونکہ وہ بعض باتوں کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ ہمارے ذہن میں باقی رہیں۔ علامہ جعفری نے سنہ ۱۹۸۴ء میں مجھ سے کہا: اپنے تمام کام چھوڑ دو اور آقا کے پاس آجاؤ۔ جب تک وہ موجود ہیں، نہ تم انہیں پہچان پاؤ گے اور نہ وہ تمہیں پہچاننے دیں گے۔ جب وہ تم سے چھین لیے جائیں گے، تب تم سمجھو گے کہ وہ کیا تھے۔ اپنے کام چھوڑ دو۔ وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں، اسے لکھو، کیسٹ ریکارڈ کرو، محفوظ کرو اور آنے والی نسل کے لیے امانت دار بنو۔

پھر انہوں نے ایک جملہ کہا جو میرے لیے بہت گراں گزرا: اگر وہ کوئی فضول بات بھی کہیں تو اسے بھی لکھو! یہ جملہ انہوں نے اپنی گہری ترکی لہجے میں کہا تھا۔ اس کی لے ابھی تک میرے ذہن میں ہے۔ جب انہوں نے کہا: "فضول بات بھی کہیں تو لکھو" تو مجھے واقعی ناگوار گزرا۔ میں نے اپنے دل میں کہا: میں یونیورسٹی میں تدریس کرتا ہوں، حوزہ میں کتاب «شفا»[1] پڑھ چکا ہوں۔ اس زمانے میں حوزہ میں صرف تین چار افراد ایسے تھے جو ریاضیات، علمِ نجوم، علمی عرفان اور اس طرح کے موضوعات پڑھتے تھے۔ اس کے باوجود علامہ جعفری کہہ رہے تھے: سب کچھ چھوڑ دو، یہاں تک کہ تمہارے والد جو فضول بات بھی کہیں، اسے بھی لکھو۔ پھر انہوں نے بات جاری رکھی: بعد میں تم سمجھو گے کہ اس بات کا مطلب کیا ہے؛ فضول بات کہنا کیا ہوتا ہے؛ اسے بھی لکھ لینا۔ میں اس دن اپنی حجرے میں گیا۔ یہ بات میرے ذہن میں گردش کرتی رہی کہ اس کا

> **آقای بہجت معتقد تھے کہ اگر انسان تعجیلِ فرج کے لیے دعا کرتا ہے، تو اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ فرج تک شیعہ کی حفاظت کے لیے دعا کرے۔**

---

(۱) بوعلی سینا کی فلسفی کتاب۔

مطلب کیا ہے؟ کیا میں اپنی تمام پڑھائی، کام اور بحث چھوڑ دوں اور صرف لکھتا رہوں؟!

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں نے آقا سے ایسی باتیں سنیں جو میرے لیے ناقابلِ قبول تھیں، یہاں تک کہ مجھے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک مجلس میں جب وہ کچھ بیان کر رہے تھے، مجھے شرمندگی محسوس ہوئی اور میں اٹھ کر باہر آگیا۔ میں اپنے دل میں کہتا تھا: بوڑھے ہیں، جو ایسے کہہ رہے ہیں۔ لیکن چند سال بعد میں نے دیکھا کہ وہی باتیں ایک ایک کر کے واقع ہو رہی ہیں۔ یہ بالکل اس واقعے کی مانند تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خندق کھودنے کے وقت چمک دیکھ کر فرمایا کہ میں نے فلاں جگہ کو دیکھا ہے، باتیں

آیت اللہ بہجت سے ملاقات میں انہوں نے سیاسی امور میں داخل ہونے کے لیے اپنے والد سے اجازت طلب کی، اور والد صاحب نے اگرچہ اس معاملے میں کسی کو اجازت دینے کا ارادہ نہیں رکھا تھا، لیکن یہاں فوراً اور پوری صراحت کے ساتھ موافقت فرمادی۔

عجیب تھیں، لیکن ممکن اور واقع ہونے والی تھیں۔ اسی وجہ سے ان بہت سی باتوں میں سے اکثر میرے ذہن میں باقی نہیں رہیں، لیکن یہ ضرور یاد ہے جو آقا مجتبیٰ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ طالب علمی کے زمانے میں بہت درس خوان تھے اور اپنے والد کی خاطر بہت محنت سے پڑھتے تھے۔

خط: رہبرِ عزیز کے ذاتی اوصاف کے بارے میں ان سالوں میں آپ کے کوئی مشاہدات ہیں؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی غفلت میں ضائع نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم ہوائی جہاز میں ساتھ سفر کر رہے تھے؛ اس وقت ابھی وہ معمم نہیں ہوئے تھے۔ پرواز میں تقریباً ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ تاخیر ہو گئی تھی۔ ہم آقا (آیت اللہ بہجت) کو جہاز میں سوار کر چکے تھے۔ اس دوران سب لوگ ناراض تھے اور مسلسل اعتراض کر رہے تھے؛ یہاں تک کہ میں نے خود بھی کہا: آقا! کیا یہ شاہی محل ہے؟ کچھ تدبیر کیجیے، سب لوگ تنگ ہو رہے ہیں! لیکن آقا مجتبیٰ نے بالکل توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ آگے بیٹھے ہوئے تھے اور اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھے؛ نہ شور شرابے کی پروا تھی اور نہ اعتراضات کی۔ صرف ایک لمحے کے لیے جب کسی نے اپنی آواز بلند کی تو میں نے دیکھا کہ انہوں نے سر موڑ کر ایک نظر ڈالی؛ اسی طرح پر سکون اور باوقار انداز میں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ اور ان کے بھائی آپس میں انگریزی زبان میں مباحثہ کر رہے تھے!

یعنی ہوائی جہاز کی اس ایک گھنٹے کی تاخیر کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا اور علمی گفتگو اور زبان کی مشق میں مشغول رہے۔ ان کی یہ عادت ہمیشہ میرے لیے باعثِ حیرت اور قابلِ تحسین رہی۔





پیامِ امت (۱)

جناب سید مجتبیٰ کے پیغامات پر گروہی سوچ بچار

مہدی قریب

اشارہ: «جناب سید مجتبیٰ کے پیغامات خود سید مجتبیٰ ہیں»؛ یہ جملہ ان کے ایک قریبی شخص کا ہے، اور اس کی اہمیت اس وقت زیادہ بہتر طور پر سمجھی جاسکتی ہے جب ہم اس بات پر توجہ کریں کہ فی الحال جناب سید مجتبیٰ سے براہِ راست رابطے اور ملاقات کا واحد ذریعہ یہی پیغامات ہیں۔ مزید یہ کہ ہر شخص کا تحریری متن اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی اعتبار سے اسے نمایاں کرتا ہے؛ «المرءُ مخبوءٌ تحتَ لسانِہ» (انسان اپنی زبان کے نیچے چھپا ہوا ہے) اور طبعاً یہ اصول ان کے بارے میں بھی صادق آتا ہے۔ البتہ انقلاب کے رہنماؤں کے متون اس لیے نہیں لکھے جاتے کہ رہنما ان کے ذریعے اپنا تعارف کرائیں۔ یعنی ان تحریروں کا مقصد اپنی شخصیت کو پیش کرنا نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہ اثر ہے جو پیغامات کے اصل مقصد کے ضمن میں ظاہر ہوتا ہے۔ ہمارے رہنما قلم اس لیے اٹھاتے ہیں کہ رہنمائی کریں، خطوطِ عمل کو واضح کریں اور مجموعی طور پر ہدایت کا فریضہ انجام دیں۔ لہٰذا ان متون سے ہمارا سامنا ہو تو ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

ان پیغامات کے بارے میں ایک اور اہم نکتہ ان کی دقت اور باریک بینی ہے۔ یہ تقریباً ایک عمومی اصول ہے کہ عموماً لوگوں کی تحریری تصانیف ان کی زبانی گفتگو کے مقابلے میں زیادہ دقیق ہوتی ہیں۔ لیکن اس اصول سے قطع نظر، ہر متن الگ سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کس حد تک دقیق ہے؛ اس اعتبار سے کہ آیا اس میں مطلوبہ عقلانیت موجود ہے یا نہیں؟ کیا وہ باہم مربوط اور منسجم ہے یا اس میں تضاد اور بے ربطی پائی جاتی ہے؟ کیا اس میں کافی جامعیت ہے یا بہت سی چیزیں نظر انداز ہو گئی ہیں؟ اور اسی نوعیت کی دوسری خصوصیات۔ جناب سید مجتبیٰ کے متون دقیق اور عمیق ہیں، اور ان کے قریبی افراد کی گواہیاں بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں، جو کہتے ہیں کہ جناب سید مجتبیٰ الفاظ کے استعمال میں بہت توجہ کرتے ہیں۔ یہ توجہ ایک طرف ہمارے رہنماؤں کے تقوائے کلام کی وجہ سے ہے، اور دوسری طرف ان کے علم، تجربے اور یقیناً حکمت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بنیاد پر ان کے پیغامات کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے، جس کا ایک طریقہ «باہمی مطالعہ» ہے؛ یعنی چند افراد مل کر بیٹھیں، پیغام پڑھیں اور اس کے بارے میں گفتگو اور تبادلۂ خیال کریں۔

پیشِ نظر متن جناب سید مجتبیٰ کے پہلے پیغام پر گروہی سوچ بچار کا نتیجہ ہے، جو خانۂ طلابِ جوان کے چند اراکین نے انجام دیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد حوزہ علمیہ کے نوجوان اہلِ فضل ہیں، جو رائج حوزوی تعلیمات اور اعلیٰ سطح کے دروس کی تدریس کے علاوہ، کتبِ امامینِ انقلاب کے محققین میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ یعنی انہوں نے امام خمینیؒ اور امام شہیدؒ کے بہت سے متون کا مطالعہ کیا ہے، ان پر بحث و گفتگو اور فکری تبادلہ کیا ہے، اور ان دونوں عظیم شخصیات کے افکار کے بعض ابواب کو اپنے اجتماعی اور انفرادی تحقیقی موضوعات بھی بنایا ہے۔ نشریہ خط، اس نشست کے نکات پیش کرتے ہوئے، آپ کو بھی جناب سید مجتبیٰ کے متون کے اجتماعی مطالعے کے اس شیریں اور قیمتی تجربے کی دعوت دیتا ہے۔



«پہلا پیغام»

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کا بحیثیتِ رہبرِ انقلابِ اسلامی، ایران اور دنیا کے عوام کے نام پہلا پیغام

◈ پہلا پیغام، «سورۂ ملت» تھا، اور خود آقا مجتبیٰ کی تصریح کے مطابق اس پیغام کا مرکزی نکتہ وہ حصے تھے جن میں عوام کا ذکر کیا گیا ہے۔

﴿مانَنسَخ مِن آيَةٍ أَو نُنسِها نَأتِ بِخَيرٍ مِنها أَو مِثلِها﴾

اس آیتِ کریمہ سے استشہاد کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ یہ بندہ شہید رہبر کے ہم پلہ ہو، چہ جائے کہ خود کو ان سے برتر تصور کرے؛ بلکہ اس مبارک آیت کے ذکر کا مقصد آپ ملت عزیز کے کردار اور آپ کی نمایاں حیثیت کی طرف توجہ دلانا ہے۔ اگر وہ عظیم نعمت ہم سے سلب ہوگئی، تو اس کے بدلے ایک مرتبہ پھر ملتِ ایران کی عمار صفت موجودگی اس نظام کو عطا ہوئی۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ اگر میدان میں آپ کی طاقت ظاہر نہ ہو، تو نہ رہبری اور نہ ہی مختلف ادارے، جن کی حقیقی شان عوام کی خدمت ہے، مطلوبہ کارکردگی دکھا سکیں گے۔

◈ سوگوار عوام کے لیے اس پیغام کی پہلا جلوہ تسلیِ قلب اور اظہارِ تعزیت تھی، اور یہ آقا مجتبیٰ کے قلبی اطمینان کی علامت ہے۔

◈ پیغام کا ماورائے متن پہلو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ حکمرانی اور نظمِ حکومت کے حوالے سے ان کا ذہنی نظام منسجم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زمینی حقائق کا جامع ادراک بھی موجود ہے، جس کا اظہار ان کے پہلے ہی پیغام میں آبنائے ہرمز کو بند رکھنے کی ہدایت سے ہوا۔

◈ متن واضح طور پر امامِ شہید کے راستے کے تسلسل کو نمایاں کرتا ہے؛ مضبوط ایران، اسلامی تمدن کی طرف پیش قدمی، شیطانِ اکبر کے مقابل سخت رویہ اور اسی نوعیت کے دیگر موضوعات اس کی مثال ہیں۔

◈ جناب سید مجتبیٰ عین اسی مقام سے سفر کو آگے بڑھاتے ہیں جہاں امامِ شہیدِ انقلاب نے اسے چھوڑا تھا؛ یعنی عوام کی دوبارہ بعثت کے اسی مرحلے سے، جو امامِ شہید کی مجاہدتوں کا ثمرہ ہے۔

◈ پیغام جامع ہے اور اس میں ہمارے معاشرے کے بنیادی مسائل، جیسے معیشت، مزاحمت، عوام اور دیگر اہم موضوعات شامل ہیں۔ پیغام کی تقسیم بھی اس جامعیت کا ایک اور مظہر ہے، اس طرح کہ ہر حصہ اپنے مخصوص مخاطب سے خطاب کرتا ہے اور ایک اہم موضوع کے بارے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

◈ اس متن سے آسانی کے ساتھ ارتباط قائم کیا جاسکتا ہے۔ جناب سید مجتبیٰ کی شخصیت اس تحریر میں نمایاں ہے، اور قاری الفاظ کے پس منظر میں ان سے ایک قلبی تعلق محسوس کرسکتا ہے۔

◈ حضرت امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب «مصباح الہدایۃ» میں بیان کردہ عرفانی مبانی کی روشنی میں، ہم نے ولایت کی علامت کو مشیتِ الٰہی میں حضور اور اس کے تجلی پذیر ہونے میں پہچانا ہے؛ وہی حقیقت جو وحدت و کثرت، خلوت و جلوت، عقل و عشق، حماسہ و شفقت کو یکجا رکھتی ہے؛ وہی جو ذوالعینین ہے۔ ان کے تمام متون انسان کو اسی احساس سے سرشار کرتے ہیں؛ دنیا و آخرت پر محیط ایک جامعیت کا احساس۔

◈ اُن کی زبان اور شہید رہبر کے بارے میں اُن کا اسلوبِ بیان نہایت عمیق، دل نشیں اور بیک وقت جمالیاتی حسن کا حامل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی قیادت میں ہماری ثقافتی اصطلاحات اور ادبی روایت میں ایک بلند پایہ تہذیبی اسلوب داخل ہوگا۔

"جس مقام پر دو عظیم الشان پیشواؤں، امام خمینیؒ اور شہید خامنہ ای، جلوہ افروز رہے ہوں، وہاں متمکّن ہونا یقیناً ایک دشوار ذمہ داری ہے؛ کیونکہ یہ وہ مسند ہے جس پر اس ہستی نے بیٹھ کر، جو خدا کی راہ میں ساٹھ برس سے زائد عرصہ مسلسل مجاہدہ کرنے اور ہر طرح کی آسائشوں اور لذتوں سے گزر جانے کے بعد، ایک درخشاں گوہر اور ایسی ممتاز شخصیت بن گئی جو صرف موجودہ دور ہی نہیں بلکہ اس ملک کے تمام حکمرانوں کی تاریخ میں بھی بے مثال حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کی زندگی بھی عظمت و وقار سے عبارت تھی اور اُن کی شہادت بھی حق پر کامل توکل سے پیدا ہونے والی عزت و شوکت کا مظہر تھی۔"

◈ آقا مجتبیٰ صاحبِ روایت ہیں۔ وہ واقعات کو جزئیات کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی ایسی تصویری اور علامتی فضا قائم کرتے ہیں جو نفسیاتی جنگ اور تہذیبی تعمیر، دونوں میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔

"مجھے یہ سعادت حاصل ہوئی کہ میں نے اُن کے جسدِ مطہر کی زیارت شہادت کے بعد کی۔ جو منظر میں نے دیکھا، وہ صلابت کے ایک عظیم پہاڑ کا منظر تھا؛ اور میں نے سنا کہ اُن کے سالم ہاتھ کی مٹھی بدستور بندھی ہوئی تھی۔"

◈ کلام کے آغاز میں آیتِ کریمہ ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ...﴾ سے جو معنوی تعلیق پیدا کی گئی، پھر خود ہی اس کے مقصود کی وضاحت فرمائی، وہ اُن کے دقیق اور حکیمانہ اسلوبِ تحریر کی نمایاں مثال ہے۔

◈ کہا جاسکتا ہے کہ مکتبِ امام کی روح توحید ہے اور اس کا قلب دینی عوام سالاری؛ اور یہ دونوں حقیقتیں جناب سید مجتبیٰ کے تجزیات میں پوری وضاحت کے ساتھ جلوہ گر ہیں، جیسا کہ اس جملے میں، جو در حقیقت آیتِ کریمہ ﴿هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ﴾[1] کے مضمون کی ترجمانی کرتا ہے:

---

(۱) سورۂ انفال، آیت ۶۲۔

"اسی لیے ایسی عظیم شخصیت کے بعد منصبِ قیادت سنبھالنا نہایت دشوار ہے، اور اس فاصلے کو صرف اللہ تعالیٰ کی مدد اور آپ عوام کی نصرت ہی پُر کر سکتی ہے۔"

◈ عوام کے بارے میں اُن کا تجزیہ مکمل طور پر مکتبِ امام کی حقیقی روح سے ہم آہنگ ہے؛ وہی حقیقت جسے ہمارے شہید رہبر نے چودہ خرداد کی تقاریر میں حرمِ مطہرِ امام خمینیؒ میں بیان فرمایا تھا، اور اس بات پر زور دیا تھا کہ انقلاب کا تسلسل صرف مکتبِ امام کے ذریعے ممکن ہے۔

"حالیہ واقعے میں ملتِ عظیمِ ایران کی بصیرت، بیداری، استقامت، شجاعت اور فعال موجودگی نے دوستوں کو تحسین پر اور دشمنوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی قیادت بھی آپ ہی عوام نے کی اور اس کی قوت و اقتدار کی ضمانت بھی آپ ہی بنے۔"

◈ "عوام کی قیادت" وہی فکر ہے جس کا اعلان حضرت امامؒ نے یکم اپریل ۱۹۷۹ء (۱۲ فروردین ۱۳۵۸)، یعنی یومِ جمہوریۂ اسلامی ایران کے موقع پر اپنے تہنیتی پیغام میں فرمایا تھا: "میں اس مبارک دن، جو امت کی امامت اور ملت کی فتح و کامرانی کا دن ہے، جمہوریۂ اسلامی ایران کے قیام کا اعلان کرتا ہوں۔"[1]

◈ حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ اس عظیم حقیقت، یعنی "عوام کی قیادت" کو ایک ماہر مربی کی تربیتی کاوش کے طور پر بیان کرتے ہیں؛ ایسا مربی جو پوری امت کی تربیت کا ذمہ دار ہو۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ خود اسی حصے کو اپنے کلام کا بنیادی نکتہ قرار دیتے ہیں۔

"مزید یہ ضروری ہے کہ میں ایک ایسے نکتے پر زور دوں جس کا میرے اصل مدعا سے براہِ راست تعلق ہے، اور وہ یہ ہے کہ شہید رہبر اور اُن کے عظیم پیش رو کے اہم ترین ہنروں میں سے ایک یہ تھا کہ انہوں نے عوام کو ہر میدان میں شریک کیا، مسلسل انہیں بصیرت و آگاہی عطا کی، اور عملی میدان میں انہی کی قوت پر اعتماد کیا۔ انہوں نے حقیقتاً 'جمہور' اور 'جمہوریت' کو عملی وجود بخشا، اور دل کی گہرائی سے اس پر ایمان رکھتے تھے۔"

◈ تاریخِ علم کے ادوار سے متعلق مباحث کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس حقیقت کی جدید دور میں ولادت یومِ جمہوریۂ اسلامی سے ہوئی، اس کی نشوونما، استحکام اور عملی تحقق شہید رہبر کے دورِ زعامت میں سامنے آیا، جبکہ اس کی بلوغت اور سنہری دور اُن کی شہادت کے بعد، منتخب رہبر کی عدم موجودگی کے مرحلے میں نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔

◈ اس پیغام کا ایک اور اہم پہلو رہبر اور دیگر ذمہ دار اداروں کے مقام و منزلت کے بارے میں اُن کا تصور ہے؛ یعنی خدمت، وہی حقیقت جسے ہمارے شہید رہبر بارہا ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا: "میرے اور میرے جیسے دیگر ذمہ داروں کے وجود کا فلسفہ صرف خدمت ہے۔ ہم عوام کے خادم اور خدمت گزار ہیں، ہماری عزت و آبرو اسی میں ہے، اور اسلام نے ہمارے لیے یہی معیار مقرر کیا ہے۔"(۱)

"یہ بات اچھی طرح جان لیجیے کہ اگر آپ عوام کی طاقت میدان میں موجود نہ ہو، تو نہ رہبر اور نہ ہی کوئی دوسرا ادارہ، جس کی حقیقی حیثیت عوام کی خدمت ہے، اپنی ذمہ داری مؤثر طریقے سے انجام دے سکتا ہے۔"

◈ انقلاب کے دوسرے مرحلے (گامِ دوم) میں انقلابی ممتاز افراد کے لیے بھی اس نکتے پر توجہ نہایت اہم ہے؛ کیونکہ اسی مرحلے میں متوسط حلقوں کا تصور پیش کیا گیا، اور درحقیقت ممتاز افراد کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ اسلامی ریاست کے نئے ڈھانچے کا فعال حصہ بنیں۔ شہید

---

(۱) صحیفۂ امام، جلد ۶، ص ۴۵۲۔

رہبر کی نظر میں ممتاز وہ ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کو خدمتِ خلق کے لیے بروئے کار لائے، نہ کہ خود کو ایک مراعات یافتہ طبقہ سمجھ کر مزید سہولتوں کا مطالبہ کرے۔ "ممتاز شخص خود کو نظام کا طلبگار نہیں سمجھتا، نہ ہی عوام کا مقروض سمجھتا ہے؛ بلکہ وہ خود کو ایسا شخص سمجھتا ہے جو اس قوم کی خدمت کر سکتا ہے، اور اس خدمت کو اپنی ذمہ داری جانتا ہے۔"(۱)

◈ عوام کی قوت کو میدان میں زیادہ مؤثر انداز میں ظاہر کرنے کے لیے حضرت آقا سید مجتبیٰ کے بیان کردہ چار بنیادی اصول نہایت اہم اور اسٹریٹجک حیثیت رکھتے ہیں۔

"اوّل: اللہ تعالیٰ کی یاد، اُس پر کامل توکل، اور انوارِ طیبۂ معصومین علیہم السلام سے توسل کو ایسے اکسیرِ اعظم اور کبریتِ احمر کے طور پر دیکھا جائے جو ہر قسم کی کشادگی اور دشمن پر یقینی فتح کا ضامن ہے۔ یہ وہ عظیم امتیاز ہے جس سے تم بہرہ مند ہو، جبکہ تمہارے دشمن اس سے محروم ہیں۔

دوم: ملت کے تمام طبقات اور افراد کے درمیان وحدت کو، جو بالخصوص آزمائش اور تنگی کے مواقع پر نمایاں ہو جاتی ہے، کسی بھی طرح نقصان نہ پہنچنے دیا جائے۔ یہ مقصد اختلافی امور سے صرفِ نظر کرنے کے ذریعے حاصل ہوگا۔

سوم: میدان میں مؤثر اور فعال موجودگی برقرار رکھی جائے؛ خواہ اس صورت میں جس کا مظاہرہ آپ نے ان جنگی دنوں اور راتوں میں کیا، یا سماجی، سیاسی، تربیتی، ثقافتی، بلکہ حتیٰ کہ امن وعامہ کے میدانوں میں مؤثر کردار ادا کرنے کی مختلف صورتوں میں۔

چہارم: ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے کبھی غفلت نہ برتیں... اور میں اسی موقع پر تمام خدماتی اداروں سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملت کے ان عزیز افراد اور عوامی امدادی ڈھانچوں کی ہر ممکن اعانت اور مدد سے دریغ نہ کریں۔"

◈ جمہوریۂ اسلامی کے رہنماؤں کے نزدیک عوامی کردار کا تصور، عوامیت پسندی (Populism) سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ وہ عوام کی فعال شرکت پر بھرپور زور دیتے ہیں، لیکن اداراتی نظام کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے لیے رہنمائی، تنظیم اور سہولت فراہم کرنے کا کردار متعین کرتے ہیں۔ یہ اس نظریے سے یکسر مختلف ہے جو تمام اداروں کو ختم کر کے ہر چیز عوام کے سپرد کرنے یا اداروں کو محض رکاوٹ سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔

"مؤثر عوامی موجودگی برقرار رہنی چاہیے؛ خواہ اس صورت میں جس کا مظاہرہ آپ نے ان جنگی دنوں اور راتوں میں کیا، یا سماجی، سیاسی، تربیتی، ثقافتی، بلکہ امن وعامہ کے میدانوں میں مختلف مؤثر کرداروں کی صورت میں...

اسی موقع پر میں خدماتی اداروں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ملت کے ان عزیز افراد اور عوامی امدادی کمیٹیوں کی ہر ممکن مدد اور اعانت سے دریغ نہ کریں۔"

◈ حضرت ولیِ عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے اُن کا قلبی تعلق، جو وہ "ہمارے آقا، بقیۃ اللہ" جیسی تعبیر سے بیان کرتے ہیں، نہایت دل نشیں اور محبت آفریں ہے۔ جب بھی یہ تعبیر اُن کی زبان سے سننے کو ملتی ہے، دل میں امامِ زمانؑ سے عشق و عقیدت پہلے سے کہیں بڑھ جاتی ہے۔ گویا ہمارے آقا جناب سید مجتبیٰ خامنہ ای واقعی اس معنی میں آیت اللہ العظمیٰ ہیں یعنی ایسی بلند مرتبہ نشانی جسے اپنی ذات ملحوظ خاطر نہیں، صرف حضرت ولیِ عصر ارواحنا فداہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

---

(۱) چھٹی قومی کانفرنس برائے ممتاز نوجوان سے خطاب، ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۲۔

کیا ہی خوبصورت جرم!

ایک شاگرد کے تاثرات

انٹرویو



آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کی شخصیت، ایک ایسے شاگرد کی نظر میں جس نے تقریباً بیس برس تک اُن سے کسبِ فیض کیا۔

اشارہ: ہم نے متعدد افراد سے سنا تھا کہ فلاں صاحب سے ضرور گفتگو کیجیے، لیکن وہ ہر بار انکار کر دیتے تھے۔ ہمیں بار بار اصرار کرنا پڑا، اور بالآخر انہوں نے ایک شرط کے ساتھ آمادگی ظاہر کی: ان کا نام اور تصویر رسالے میں شائع نہ کی جائے۔ اس کی اصل وجہ ہمیں پوری طرح معلوم نہیں، البتہ غالب گمان یہی ہے کہ یہ اُن کی اخلاقی احتیاط، شہرت سے گریز اور اسی نوع کے دیگر ملاحظات کا نتیجہ تھا۔ جناب سید مجتبیٰ کے بعض دیگر قریبی احباب میں بھی ہم نے یہی طرزِ عمل دیکھا ہے۔

وہ تقریباً بیس برس تک آقا مجتبیٰ کے شاگرد رہے ہیں، اور اس وقت خود بھی حوزۂ علمیہ میں سطوحِ عالیہ کے استاد ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ابتدا میں ہمارا مقصد صرف آقا مجتبیٰ کی علمی شخصیت اور درسی مباحث کے بارے میں گفتگو کرنا تھا، مگر انٹرویو کے ابتدائی لمحات ہی میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ یہاں صرف علمی گفتگو نہیں، بلکہ بہت سے ایسے پہلو بھی سامنے آئیں گے جو کہیں زیادہ اہم اور دل چسپ ہیں۔ یہ انٹرویو دراصل اُس نوجوان شاگرد کی نظر میں آیت اللہ آقا سید مجتبیٰ خامنہ ای کی شخصیت کا ایک مختصر خاکہ ہے، جس نے قریب بیس سال تک اُن سے علم حاصل کیا۔

ہم اس بے نام و نشان گفتگو کو نشریہ «خط» پر اعتماد کرتے ہوئے قبول کرنے پر آپ کے حسنِ ظن کے شکر گزار ہیں۔

خط: آپ کب سے انہیں جانتے ہیں؟

میں تقریباً سال ۲۰۰۶ء سے مسلسل اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں۔ ابتدا میں وہ مدرسہ اباصالح علیہ السلام میں «حلقات»[۱] کی تدریس فرماتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے «مکاسب»[۲] کا درس شروع کیا، اور ابتدا کتاب البیع[۳] سے کی۔ ایک دو سال بعد، جب ہم وہیں اُن کے درس میں شریک تھے، وہ مدرسۂ فیضیہ کے ایک نہایت سادہ حجرے میں منتقل ہو گئے۔ اس وقت ہماری تعداد بھی بہت کم تھی؛ شاید چار یا پانچ افراد سے زیادہ نہ تھی۔ وہاں انہوں نے «خیارات»[۴] کا درس دیا۔ یوں مجھے تقریباً تین سال تک اُن سے «مکاسب» پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

---

(۱) «دروس فی علم الاصول» (حلقات): یہ اصولِ فقہ کی معروف کتاب ہے جسے شہید آیت اللہ سید محمد باقر صدرؒ نے تین مراحل میں تالیف کیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ مجموعہ «حلقات» کے نام سے مشہور ہے، اور ہر مرحلہ ایک «حلقہ» کہلاتا ہے۔

(۲) «المکاسب»: فقہِ جعفری کی نہایت اہم اور بنیادی کتاب، جسے شیخ مرتضیٰ انصاریؒ نے تالیف کیا۔ یہ کئی دہائیوں سے حوزۂ علمیہ کے بنیادی درسی متون میں شامل ہے۔ طلبہ ابتدائی مراحل مکمل کرنے کے بعد اس کا درس پڑھتے ہیں، اس لیے اسے حوزہ کے سطوحِ عالیہ کے نصاب کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی کتاب کو فقہ کے درسِ خارج میں بھی بنیادی متن کے طور پر تحقیق و تدقیق کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) «البیع»: کتاب «المکاسب» کا ایک باب، جس میں خرید و فروخت سے متعلق فقہی احکام بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) «الخیارات»: کتاب «المکاسب» کا ایک اور باب، جس میں عقد کے فریقین کے لیے معاہدہ فسخ کرنے کے اختیارات اور ان سے متعلق فقہی احکام پر بحث کی گئی ہے۔

ہمارا معمول یہ تھا کہ ہر تعلیمی سال کے اختتام پر دوست احباب مل کر ظہرانے کا اہتمام کرتے، انہیں دعوت دیتے، اور اسی موقع پر درخواست کرتے کہ آئندہ سال بھی تدریس جاری رکھیں۔ تعلیمی سال ۲۰۰۸-۲۰۰۹ء کے اختتام پر (یعنی مئی ۲۰۰۹ء) دوستوں نے دوبارہ ظہرانے کا اہتمام کیا اور عرض کیا کہ اگلے سال ہمیں «خیارات»، یعنی «مکاسب» کا آخری حصہ بھی پڑھا دیجیے۔ اسی موقع پر انہوں نے مجھ سے فرمایا: "اگر میں پڑھاؤں تو کیا تم بھی آؤ گے؟" میں نے عرض کیا: "نہیں، میں نہیں آؤں گا۔" فرمایا: "کیوں؟" میں نے کہا: "میں اب «مکاسب» مزید نہیں پڑھنا چاہتا۔ اگر آپ درسِ خارج[1] پڑھائیں گے تو ضرور حاضر ہوں گا۔" چنانچہ اگلے سال انہوں نے ہم چار پانچ افراد کے لیے درسِ خارج کا آغاز فرمایا، اور ابتدا «تسبیحاتِ اربعہ» کی بحث سے کی۔ درحقیقت یہ باقاعدہ درسِ خارج سے پہلے ایک طرح کی تمہید تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ «تسبیحاتِ اربعہ» کے بارے میں روایات کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے اور ان کے درمیان تعارض بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس زمانے میں یہ درس دفترِ آقا[2] میں ہوتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ طور پر درسِ خارجِ فقہ کا آغاز کیا، وہ بھی فقہ کی ابتدا سے۔ اور تقریباً ایک سال بعد درسِ خارجِ اصول بھی رسمی طور پر شروع فرما دیا۔

خط: اُن کا اسلوبِ تدریس کیسا تھا؟ کیا وہ کوئی خاص طریقۂ تدریس اختیار کرتے تھے؟

کتاب «المکاسب» کی تدریس میں اُن کا کوئی غیر معمولی یا منفرد اسلوب نہیں تھا؛ بلکہ وہ عمومی اور معروف طریقۂ تدریس ہی اختیار کرتے تھے۔ البتہ وقتاً فوقتاً وہ درس سے متعلق کوئی مفید کتاب ساتھ لاتے، طلبہ کو دکھاتے، اس کا تعارف کراتے اور اس کے مطالعے کی ترغیب دیتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے درسِ خارج کا آغاز کیا تو ایک نہایت مؤثر اور اختراعی طریقہ اپنایا۔ وہ پہلے زیرِ بحث مسئلہ طلبہ کے سپرد کر دیتے۔ طلبہ مختلف علمی طریقوں سے اس پر تحقیق کرتے، پھر کلاس میں اپنی تحقیقات پیش کرتے۔ اس کے بعد وہ ان کی گفتگو پر علمی نکات بیان فرماتے، اور آخر میں خود استاد کی تفصیلی تقریر ہوتی۔ اس طرح درس کی فضا ایک علمی ورکشاپ کی صورت اختیار کر لیتی تھی، جو طلبہ کی علمی نشوونما میں نہایت مؤثر ثابت ہوتی تھی۔

خط: کیا یہ وہی سامرائی[3] طریقۂ تدریس تھا؟

اس بارے میں مجھے علم نہیں۔ البتہ بعد میں جب درس میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی، تو یہ اندازِ تدریس بھی بتدریج ختم ہو گیا۔

خط: تحصیل کے طریقے کے بارے میں وہ کوئی خاص نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے؟

وہ پیشگی مطالعہ (پیش مطالعہ) پر بہت زور دیتے تھے اور فرمایا کرتے تھے: "پیشگی مطالعہ انسان کی علمی ترقی کا سبب بنتا ہے۔" اسی طرح وہ آزاد اندیشی پر بھی بہت تاکید فرماتے تھے۔ اُن کا ایک نہایت خوبصورت جملہ تھا: "اگر تم واقعی ترقی کرنا چاہتے ہو تو ہر بات سن کر پہلے یہ پوچھو: 'یہ کس نے کہا ہے؟!' "یعنی کسی بات کو بغیر تحقیق فوراً قبول نہ کرو، بلکہ اس پر غور و فکر کرو۔ یہی وہ طریقہ تھا جس پر وہ خود بھی عمل کرتے تھے؛ حتیٰ کہ بنیادی ترین علمی مبادیات

---

(۱) درسِ خارج: حوزۂ علمیہ میں تعلیم و تدریس کا اعلیٰ ترین مرحلہ، جہاں طلبہ تخصص، اجتہاد اور علمی استقلال کی منزل کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔

(۲) دفترِ امامِ شہید: قم میں شہدا اسٹریٹ (صفائیہ) پر واقع دفتر۔

(۳) حوزوی حلقوں میں مشہور ہے کہ حوزۂ علمیہ سامراء میں تعلیم و تدریس کا ایک منفرد طریقہ رائج تھا، جس میں طلبہ بھی درس کی پیش رفت میں فعال کردار ادا کرتے تھے، اور درس کی نشست ایک حد تک استاد اور شاگرد کے درمیان علمی مباحثے کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

میں بھی۔ گویا اُن کے نزدیک علم کی پہلی منزل یہ تھی کہ انسان ہر چیز کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، پھر تحقیق کی بنیاد پر اپنی علمی عمارت تعمیر کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ اس عمارت کو نہایت مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر استوار کرتے تھے۔ تقریباً ایسا ممکن نہ تھا کہ آپ کسی عالم کا نام لیں، خواہ وہ کم معروف ہی کیوں نہ ہو، اور وہ اُس کے حالات بیان نہ کر دیں؛ مثلاً اُس کا سالِ وفات، وہ کہاں کے رہنے والے تھے، اُن کے اساتذہ کون تھے۔

خط: آپ کی نظر میں اُن کے درس کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں؟

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اُن کے پاس ایک فکری منظومہ ہے، اور یہ ایک منفرد خصوصیت ہے۔ بعض افراد صرف علمِ اصول[1] میں فکری منظومہ رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو اس سے بھی محروم ہوتے ہیں؛ یعنی خود علمِ اصول ہی میں آپ دیکھتے ہیں کہ اُن کی ایک بات دوسری جگہ کی بات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ لیکن بعض حضرات علمِ اصول میں فکری منظومہ رکھتے ہیں؛ جیسے مرحوم نائینی۔ وہ فرمایا کرتے تھے: مرحوم نائینی کے اپنے اصولی مبادیات کی بنیاد پر تقریباً اُن پر (یعنی مرحوم نائینی پر) اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن خود وہ ان سب سے ماورا ہیں؛ یعنی صرف اُن کا علمِ اصول ہی ایک منظومہ نہیں، بلکہ اُن کا علمِ کلام[2]، تفسیر، فقہ، اصول اور علمِ رجال[3] بھی سب ایک ہی مربوط منظومے کا حصہ ہیں۔ بعض حضرات علمِ کلام میں ایک بات کہتے ہیں، لیکن جب فقہ اور اصول میں آتے ہیں تو اسے ایک طرف رکھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں: «نحن أبناء الدليل»؛ یعنی دلیل اور ظہور[4] جس بات پر دلالت کرے، ہم اسی کے پابند ہیں۔ لیکن اُن کا طریقہ ایسا نہیں ہے۔ وہ فرماتے تھے: جس خدا کو ہم نے علمِ کلام میں ان صفات کے ساتھ ثابت کیا ہے، یہاں بھی وہی خدا یہ کلام فرما رہا ہے۔

دوسری بات، اُن کے ذہن کا غیر معمولی انسجام ہے۔ یہ فکری منظومے سے الگ ایک خصوصیت ہے۔ یعنی وہ پوری طرح جانتے ہیں کہ کون سی چیز زیرین اور بنیاد ہے اور کون سی بالائی اور اس پر قائم ہے، اور اسی ترتیب کے ساتھ نہایت دقت سے اپنے استدلال کو آگے بڑھاتے ہیں۔

ایک اور نمایاں خصوصیت روایات کے ساتھ اُن کی گہری اُنسیت اور روایات کے سامنے اُن کا بھرپور تعبد ہے۔ وہ ہمیں بھی ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ کتبِ حدیث کا مطالعہ کیا کرو۔ میرے خیال میں اُن کے فکری منظومے کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر کردار روایات ہی کا رہا ہے۔

خط: آپ کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے نزدیک علمِ کلام کے اصول بنیاد ہیں اور فقہ و اصول اُن پر قائم ہیں؟

ہم نے اُن سے علمِ کلام کا درس تو نہیں پڑھا، البتہ تفسیر کا ایک درس تھا، جس میں اُن کا کلامی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا تھا۔

خط: کیا اُن کا تفسیر کا مستقل درس بھی ہوتا تھا؟

نہیں، یہ اُن کے درسِ فقہ کے آغاز میں ہوتا تھا۔ چند برس تک وہ تفسیر کا درس دیتے رہے، لیکن بعد میں اُنہوں نے مناسب نہ سمجھا کہ اسے جاری رکھیں۔

خط: اُن کی اخلاقی اور ذاتی خصوصیات کے بارے میں کچھ بیان فرمائیے۔

---

(۱) علمِ اصول: وہ علم جس میں معارفِ دینی کے مصادر (یعنی قرآن، روایات اور عقل) سے استفادہ اور استنباط کے قواعد بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ حوزہ علمیہ کے اہم ترین علوم میں سے ہے اور طالب کی تعلیم و تحقیق کا ایک بڑا حصہ اسی سے متعلق ہوتا ہے۔

(۲) علمِ کلام: وہ علم جو اسلامی عقائد کے اثبات اور اُن کے دفاع سے بحث کرتا ہے۔

(۳) علمِ رجال: وہ علم جس میں راویانِ حدیث کے حالات اور اُن کے قابلِ اعتماد یا ناقابلِ اعتماد ہونے کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۴) ظہور: علومِ قرآن و حدیث، خصوصاً فقہ، کی ایک اصطلاح ہے، جس سے مراد کسی متن سے بظاہر سمجھ میں آنے والا مفہوم ہے۔

ایک مرتبہ میں نے اُن سے کہا: آپ کا جرم صرف یہ ہے کہ آپ آقا (رہبر معظم) کے فرزند ہیں! میرا مقصود یہ تھا کہ آقا کے فرزند ہونے کی وجہ سے آپ ایک دائرے میں محدود ہو گئے ہیں اور اپنی حقیقی شخصیت کو پوری طرح ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس پر اُنہوں نے نہایت خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: کیا ہی خوبصوت جرم ہے! وہ آقا سے بے حد محبت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا: میرا دل نہیں چاہتا کہ آقا سے جدا رہوں؛ میں ہر روز دوپہر کو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں اور اُن کی خیریت دریافت کرتا ہوں۔

میری نظر میں چند صفات ایسی ہیں جن میں اُن کی آقا سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔ ان میں سے ایک غیر معمولی مطالعہ ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا: شادی سے پہلے اور مصروفیات بڑھنے سے پہلے، میرے لیے ایک چائے کی کیتلی اور ایک کتاب شام تک کافی ہوتی تھی۔ وہ تیز رفتاری سے مطالعہ بھی کرتے ہیں۔

دوسری نمایاں خصوصیت، جو بہت حد تک آقا سے مشابہ ہے، تاریخ اور علمِ رجال پر اُن کی گہری دسترس ہے۔ یہاں رجال سے مراد صرف راویانِ حدیث نہیں، بلکہ ہر قسم کی معروف شخصیات ہیں۔ تقریباً ایسا ممکن نہ تھا کہ آپ کسی عالم کا نام لیں، خواہ وہ کم معروف ہی کیوں نہ ہو، اور وہ اُس کے حالات بیان نہ کر دیں؛ مثلاً اُس کا سالِ وفات، وہ کہاں کے رہنے والے تھے، اُن کے اساتذہ کون تھے، اور اسی طرح عصرِ حاضر کی شخصیات سے بھی مکمل واقفیت رکھتے تھے۔

خط: آپ کی مراد سیاسی شخصیات ہیں؟

سیاسی بھی اور غیر سیاسی بھی۔ اُن کی ایک نمایاں خصوصیت مردم داری، لوگوں کا خیال رکھنا، اور مختلف سیاسی و غیر سیاسی رجحانات رکھنے والے افراد کے ساتھ حسنِ تعلق ہے۔ بالکل آقا کی طرح، جن کے معاشرے کے مختلف طبقات کے ساتھ خوشگوار تعلقات ہیں، اُن کا طرزِ عمل بھی یہی ہے؛ حتیٰ کہ ایسے افراد کے ساتھ بھی، جن میں سے بعض کو شاید ہم اپنی سیاسی پسند و ناپسند کی بنا پر زیادہ پسند نہ کرتے ہوں۔ مثلاً فرمایا کرتے تھے: فلاں شخص کے والد دو سال پہلے فلاں بیماری میں مبتلا ہوئے تھے، اُن کی خبر گیری کریں اور اُن کا حال دریافت کریں۔

خط: لوگوں کے ساتھ اُن کا تعلق کیسا تھا؟ کیا آپ کو ٹیکسی[1] والے واقعے کا علم تھا؟

نہیں، مجھے ٹیکسی والے واقعے کا علم نہیں تھا؛ البتہ اس سے ملتے جلتے کچھ اور واقعات انہوں نے ہمیں سنائے تھے۔ یعنی شہر میں اس طرح گھومنے پھرنے کا ذکر کیا تھا، اور بعض چوراہوں کے نام بھی لیے تھے، مثلاً ولی عصر[2]۔

البتہ اس سے پہلے تقریباً سترہ اٹھارہ سال تک اُن کی زندگی بالکل معمول کے مطابق تھی۔ صرف ایک ڈرائیور تھا جو انہیں حرم اور

---

(۱) رہبرِ انقلاب نے اپنے نوروزی پیغام میں اس واقعے کی طرف یوں اشارہ فرمایا تھا: "مجھے یہ توفیق حاصل رہی کہ معاشرے کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے عزیز عوام کی باتیں براہِ راست سن سکوں۔ ایک عرصے تک، اپنی درخواست پر فراہم کی گئی ایک ٹیکسی میں، گمنام حیثیت سے آپ لوگوں کے ساتھ تہران کی سڑکوں پر سفر کرتا رہا اور آپ کی گفتگو سنتا رہا۔ میں اس قسم کے مشاہدے کو بہت سی رائے شماریوں سے بہتر سمجھتا تھا۔ متعدد مواقع پر میری رائے بھی آپ کی ان باتوں سے ہم آہنگ ہوتی تھی جو عموماً معاشی اور انتظامی امور پر مختلف نوعیت کی تنقید کی صورت میں بیان کی جاتی تھیں۔ اس دوران میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا، اور آج بھی نئی باتیں سیکھنے کا خواہش مند ہوں۔ انہی دنوں، انیس رمضان المبارک سے پہلے اور بعد بھی، مختلف میدانوں میں موجود آپ میں سے مختلف افراد سے بہت سی نئی باتیں سیکھنے کا موقع ملا۔" — رہبرِ انقلاب کا نوروزی پیغام، آغازِ ہجری شمسی سال ۱۴۰۵

(۲) ولی عصر: تہران کے مشہور چوراہوں اور مرکزی شاہراہوں میں سے ایک کا نام۔

فیضیہ[1] لے جاتا اور واپس لاتا تھا، اور غالباً اپنی خریداری بھی وہ خود ہی کرتے تھے۔ یعنی معروف ہونے سے پہلے وہ مکمل طور پر ایک معمول کی زندگی گزارتے تھے؛ بلکہ یہ بات اُس ٹیکسی والے واقعے سے بھی بڑھ کر ہے۔

خط: آپ اُن کی اخلاقی اور عملی خصوصیات کے بارے میں بتا رہے تھے۔

وہ اس بات کے بارے میں بہت حساس تھے کہ ایرانی۔اسلامی ثقافت کی مکمل رعایت کی جائے، اور الفاظ بھی ایرانی۔اسلامی ہوں۔ اس معاملے میں وہ انتہائی حساس تھے۔ یہاں تک کہ اگر ہم مثلاً کہتے: "کلاس کب ہے؟" تو فرماتے: "کلاس تو لندن کی چیز ہے! کہیے: درس۔" لفظ "کلاس" تو عام طور پر بہت معمولی سمجھا جاتا ہے، لیکن وہ اس حد تک اس پر توجہ دیتے تھے۔ اس اعتبار سے بھی وہ آقا سے بہت مشابہ تھے۔

اُن کی ایک اور خصوصیت مختلف اخلاقی آداب کی پابندی تھی۔ مثال کے طور پر اسراف سے بچنے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ہم کسی ہال یا راہداری سے گزر رہے ہوتے، اگر وہ دیکھتے کہ کوئی کمرہ خالی ہے لیکن اس کی بتی جل رہی ہے تو اسے بند کر دیتے۔ یا کبھی ہم کسی کمرے میں بیٹھے ہوتے اور باہر اچھی روشنی ہوتی تو ہم سے پوچھتے: "آپ کی رائے میں کیا اس بتی کی ضرورت ہے؟" (ہم سے پوچھنا بھی اُن کے حسنِ اخلاق کا حصہ تھا؛ وہ ہماری رائے معلوم کیے بغیر خود بتی بند نہیں کرتے تھے، پہلے پوچھتے تھے۔) ہم کہتے: "نہیں۔" پھر وہ بتی بند کر دیتے تھے۔

یا مثلاً کم کھانے اور کم بولنے کا بھی بہت اہتمام کرتے تھے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم ایک ہی دسترخوان پر بیٹھے ہوتے اور وہ بہت کم کھانا تناول فرماتے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ وہ میرے مہمان تھے اور ضیافت کا انتظام بھی میں نے کیا تھا۔ انہوں نے آدھا کھانا کھایا، پھر مجھ سے فرمایا: "اگر اجازت ہو تو باقی کھانا اپنے گھر لے جاؤں؟" شاید ایسے مواقع پر ہم جھجک محسوس کریں کہ بچا ہوا کھانا اپنے ساتھ لے جائیں، لیکن چونکہ کھانا زیادہ تھا، اس لیے انہوں نے نہ اسے پورا کھایا اور نہ ہی باقی کھانا اسراف ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔

> **وہ اپنے روزمرہ کے امور کو نمازِ اوّل وقت کے مطابق ترتیب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ تدریس کے لیے تہران سے قم آنے جانے کا وقت بھی اس طرح طے کرتے تھے کہ نماز تہران ہی میں ادا کر سکیں۔**

اُن کی ایک اور نمایاں خصوصیت خاندان پر توجہ دینا تھی۔ وہ ہمیں بھی اس بارے میں نصیحت کیا کرتے تھے۔ کئی مرتبہ میرے اہلِ خانہ کا حال دریافت کیا، اور اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو خود اس کی پیگیری کرتے تھے۔ ایک دو مرتبہ جب ہمارے گھر میں بیماری کا معاملہ پیش آیا تو انہوں نے ذاتی طور پر ایک ایسے ڈاکٹر سے، جنہیں وہ جانتے تھے، رابطہ کیا اور ہمیں اُن کے پاس جانے کی سفارش کی۔ بلکہ مجھے یہ کہہ کر سرزنش بھی کی کہ: "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

مجھے یاد ہے کہ میرے ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر، گھر کے کاموں میں مدد کرنے اور اپنی اہلیہ کا ساتھ دینے کے لیے میں نے اپنی تدریسی مصروفیات عارضی طور پر ترک کر دی تھیں۔ میں نے اُن سے رابطہ کیا، سارا واقعہ بتایا اور عرض کیا کہ میں نے درس معطل

---

(۱) مدرسۂ فیضیہ: قم کے حوزہ علمیہ کے قدیم ترین اور اہم ترین مدارس میں سے ایک، جہاں گزشتہ کئی دہائیوں میں متعدد جید علماء نے تعلیم حاصل کی اور تدریس کی، جن میں حضرت امام خمینی بھی شامل ہیں۔ محمد رضا شاہ پہلوی کے دور میں ۱۳۴۲ھ ش (۱۹۶۳ء) میں اس مدرسے پر حملہ اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات، ایران کی سیاسی تاریخ اور اسلامی انقلاب کے اہم موڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔

کر دیے ہیں۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: "تم نے اپنی زندگی کا بہترین کام کیا ہے!"

ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ واقعی شہرت سے گریز کرتے تھے۔ آج جب میں نے اُن کی بڑی بڑی تصاویر والے بینر دیکھے تو بے اختیار ہنس پڑا اور اپنی اہلیہ سے کہا: "وہ تو اپنی تصویر سے بھی بچتے تھے، مگر آج ہر طرف اُن ہی کی تصاویر نظر آ رہی ہیں!"

اُن کی ایک اور نمایاں خصوصیت غریبوں پر خصوصی توجہ اور اُن کی خبر گیری تھی۔ خود آقا بھی فقرا کے بارے میں بہت حساس تھے، اور اُن کی والدہ محترمہ (یعنی آقا مجتبیٰ کی والدہ) بھی اسی طرح تھیں۔ آقا مجتبیٰ اپنی والدہ کی اس صفت کو بڑی عقیدت سے یاد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بیماری شدت اختیار کرنے سے پہلے وہ خود غریبوں کے گھروں میں جایا کرتی تھیں۔ وہ فرماتے تھے: "کبھی کبھی میری والدہ اس قدر متاثر ہو جاتی تھیں کہ پھر کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھیں، حتیٰ کہ رات کا کھانا بھی ترک کر دیتی تھیں۔" یہی کیفیت خود اُن میں بھی تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: "جتنا کوئی شخص زیادہ کمزور، بے سہارا اور بے کس ہو، اتنا ہی زیادہ اہم ہے۔"

ایک مرتبہ کسی نے غریبوں کے بارے میں ایک درخواست مجھے دی، جس پر تاریخ بھی درج تھی۔ میں نے وہ خط اپنے پاس رکھ لیا اور فرض کریں ایک ہفتے بعد، جب میری اُن سے ملاقات ہوئی، تو اُسے پیش کر دیا۔ انہوں نے تاریخ دیکھی اور مجھے سخت تنبیہ کی۔ میں نے عرض کیا: "آقا! میں تو اس ایک ہفتے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہی نہیں ہوا تھا، اس لیے خط نہ دے سکا۔" فرمایا: "یہ عذر کافی نہیں۔ تمہیں یہ خط ہر صورت پہنچانا چاہیے تھا۔ ایک ہفتہ کیوں تمہارے پاس پڑا رہا؟ ایک ہفتہ ایک کام مؤخر رہا!"

ایک دو مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی غریب شخص کا خط تھا، میں عرض کرتا: "حاج آقا! اس معاملے کی خصوصی پیگیری فرمائیے، میں خود جا کر اس کی حالت دیکھ کر آیا ہوں۔" تو وہ فرماتے: "میں سب کے معاملات کی خصوصی پیگیری کرتا ہوں۔"

ایک مرتبہ سرحد سے افغان شہریوں کی واپسی کے معاملے میں، غالباً ایک دس یا گیارہ سالہ بچے کو اس کی والدہ کے بغیر واپس بھیج دیا گیا تھا، یا واپس بھیجنے والے تھے۔ ایک دوست نے یہ واقعہ اُن کے سامنے بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا: "ذرا تصور کرو کہ یہ میرا محمد باقر ہے! فوراً اسے تلاش کرو اور اس کا مسئلہ حل کرو تاکہ اسے واپس لے آئیں۔"

دیگر یہ کہ وہ نماز کے بارے میں بہت حساس تھے اور اپنی تمام مصروفیات کو اوّل وقت نماز کے مطابق ترتیب دیتے تھے۔ حتیٰ کہ جب تدریس کے لیے تہران سے قم آتے جاتے تھے تو اپنے سفر کا وقت اس طرح مقرر کرتے کہ نماز تہران ہی میں اوّل وقت ادا کر سکیں، اور اگر محسوس ہوتا کہ بروقت نہیں پہنچ سکیں گے تو سفر اس انداز سے ترتیب دیتے کہ راستے میں موجود کسی نماز خانے میں اوّل وقت نماز ادا کر لیں۔ نیز وہ نوافل کے پابند تھے، بلکہ نوافل میں قرآنِ کریم کا ختم بھی کیا کرتے تھے۔

> **آیت اللہ بہجت نے انہیں نصیحت فرمائی تھی: "آپ کو جو یہ مقام حاصل ہے کہ آپ رہبرِ انقلاب کے فرزند ہیں، اسے اپنی روحانی اور معنوی ترقی کے لیے استعمال کیجیے۔"**

وہ زیارت کے بے حد شیدائی تھے اور اسے اعلیٰ ترین عبادات میں شمار کرتے تھے۔ ان دنوں جب قم تشریف لے جاتے تو اس بات کے پابند تھے کہ ہر روز حرم کی زیارت کے لیے حاضر ہوں۔ حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا پر ان کا غیر معمولی اعتقاد تھا، اسی طرح حضرت امام رضا علیہ السلام کی زیارت سے بھی انہیں خاص تعلق اور گہری عقیدت تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے ایک

نکتہ بیان فرمایا اور کہا کہ اس بات نے خود ان پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔ فرمایا: "جب تم اپنی حاجت امام رضا علیہ السلام کی بارگاہ میں پیش کرتے ہو تو امام علیہ السلام اس قدر مہربان ہیں کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے تمہاری حاجت پوری ہونے کی دعا نہیں کرتے، بلکہ تمہاری حاجت کو اپنی حاجت بنا لیتے ہیں، اور پھر اسی حیثیت سے اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کرتے ہیں۔"

خط: یا آپ کو معلوم ہے کہ ان کا کن اساتذۂ اخلاق و معرفت سے تعلق رہا؟

وہ خود بیان کرتے تھے کہ جب ابتدائی دنوں میں طلبِ علم کے لیے قم آئے تو ایسے شخص کی تلاش میں تھے جو صاحبِ معنا ہو اور انہیں روحانی سلوک کا راستہ دکھا سکے۔ انہوں نے چند افراد سے ملاقات بھی کی، لیکن انہیں محسوس ہوتا تھا کہ یہ وہ شخصیت نہیں جس کی وہ تلاش میں ہیں۔ آخر کار ان کی ملاقات آیت اللہ بہاء الدینی سے ہوئی، اور پھر وہ تفصیل کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

خط: کیا آیت اللہ بہاء الدینی بھی ان پر خاص توجہ فرماتے تھے؟

جو واقعات اور یادیں انہوں نے ہمیں سنائی تھیں، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ آیت اللہ بہاء الدینی[1] ان پر خاص شفقت اور توجہ رکھتے تھے۔ البتہ وہ اپنی ذات سے متعلق کوئی ایسی بات بیان نہیں کرتے تھے جس سے ان کی اپنی فضیلت ظاہر ہوتی ہو؛ اس معاملے میں وہ تقریباً بالکل خاموش رہتے تھے۔

خط: آیت اللہ بہاء الدینی کے بعد وہ کس کی خدمت میں جاتے تھے؟

آیت اللہ بہاء الدینی کے بعد وہ آیت اللہ بہجت کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ آیت اللہ بہجت کے ساتھ بھی ان کا بہت قریبی تعلق اور آمد و رفت تھی، اور آیت اللہ بہجت بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ مثلاً وہ خود بیان کرتے تھے: "آخری مرتبہ جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آیت اللہ بہجت بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے، لیکن ہماری خاطر انہوں نے خود کو سنبھالا اور پوری توجہ کے ساتھ ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ شرمندگی اور تردد محسوس ہوا۔"

خط: کیا یہ احترام ان کے والد کی وجہ سے تھا؟

میں اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن میرا خیال ہے کہ اگر کسی شخص کے اندر اپنی کوئی روحانی صلاحیت اور مقام نہ ہو تو اہلِ معرفت اس طرح اس کی قدر و منزلت نہیں کرتے۔

آیت اللہ بہجت کے بارے میں ایک نہایت دلچسپ بات انہوں نے ہمیں یہ بتائی کہ آیت اللہ بہجت نے ان سے فرمایا تھا: "آپ کو جو یہ مقام حاصل ہے کہ آپ رہبرِ انقلاب کے فرزند ہیں، اسے اپنے روحانی اور معنوی امور میں استعمال کیجیے۔ مثلاً اگر آپ کو حضرت امام رضا علیہ السلام کے سرداب کی زیارت کا موقع مل سکتا ہے تو ضرور جائیے، اور ایسی سہولتوں سے اجتناب نہ کیجیے۔" بعد میں وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ آقا کی برکت سے انہیں اہلِ معنا و معرفت کی بہت سی بزرگ شخصیات سے ارتباط اور استفادہ کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ تو انہوں نے تقریباً انہی الفاظ میں فرمایا: "جو بھی شخص تقویٰ اور روحانیت کا اہل تھا، میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اور کسی کو بھی اپنے ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا۔" بہرحال، وہ دنیا کی حقیقت کو اسی زاویے سے دیکھتے ہیں اور فرمایا کرتے ہیں: "دنیا کی حقیقی حقیقت بندگیِ خدا ہے۔" انہوں نے خود بھی اسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی پوری کوشش صرف کی، اور الحمدللہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس راہ میں کامیاب بھی رہے۔

خط: کیا آقا مجتبیٰ روحانی امور میں بھی کوئی نصیحتیں فرماتے تھے؟

---

(۱) مثلاً آیت اللہ بہاء الدینی انہیں "مجتبیٰ" کہہ کر ان کے پہلے نام سے مخاطب کرنا، یا عالمِ معنا سے متعلق بعض خاص نکات اور اسرار ان سے بیان فرمانا۔

وہ بہت دلچسپ نصیحتیں فرمایا کرتے تھے، جن میں سے چند ایک مجھے یاد ہیں۔ مثلاً فرماتے تھے: "جو نیک عمل تم انجام دیتے ہو، عمل کرنے کے فوراً بعد، اس سے پہلے کہ وہ کسی خرابی یا کمی کا شکار ہو، اسے تحفے کی طرح لپیٹ دو، اور مثلاً اسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کر دو۔ پھر اس ہدیے کے سبب ہمیں بھی کچھ عطا کیا جاتا ہے (یعنی ثواب دیا جاتا ہے)۔ اس کے بعد دوبارہ اسی عمل کو تحفے کی طرح لپیٹ کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دو، تو اس کے سبب پھر ہمیں کچھ عطا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح دوبارہ اسے ہدیہ کرو اور... یہ عمل اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ہمارا عمل لامحدود ہو جائے۔"

یا ماں کے رحم میں موجود بچے کے بارے میں فرماتے تھے: "جلدی اس کا نام رکھو اور اسے اس نام کے صاحب کے سپرد کر دو؛ اور یہ کام کئی معصومین علیہم السلام کی نیت سے انجام دو۔ مثلاً اگر نام محمد رکھتے ہو تو چار معصومین علیہم السلام کی نیت سے یہ کام کرو، اور اگر حسن نام رکھتے ہو تو دو معصومین علیہم السلام کی نیت سے۔" اسی طرح بچوں کے بارے میں دوبارہ فرمایا کرتے تھے: "ان بچوں کی نیابت میں بھی اعمال انجام دو جو ابھی بڑے نہیں ہوئے۔ مثلاً اپنے بچے کی نیابت سے نمازِ شب پڑھو؛ یہ عمل اس بچے پر اثر انداز ہوتا ہے۔"

خط: اس بات کے بارے میں کہ کہا جاتا ہے کہ وہ آقا کے مددگار تھے، کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟

یہ دراصل ان کا اپنا بیان ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: "میں نے اپنے لیے ایک ذمہ داری متعین کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ میں دیکھتا رہتا ہوں کہ جہاں کہیں کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا ہے، وہاں جا کر اسے کس دیتا ہوں۔" یعنی انہوں نے اپنے لیے کوئی خاص دائرۂ کار مقرر نہیں کیا تھا؛ لیکن یہ سب کچھ انتہائی گمنامی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

بعض مسائل جو میں خود ان کے سامنے پیش کرتا تھا، وہ فرماتے تھے: "جاؤ، اس کے بارے میں ایک رپورٹ لے آؤ۔" واقعی ہم دیکھتے تھے کہ ایک سال کے اندر اندر وہ معاملہ "سُلجھ" کی طرح حل ہو جاتا تھا، لیکن کہیں بھی ان کا نام سامنے نہیں آتا تھا۔ چند سال پہلے جب میں ان کی خدمت میں گیا تو انہوں نے فرمایا: "کچھ عرصے سے میں چند مسائل پر کام کر رہا ہوں؛ ان کے لیے تفصیلی نشستیں رکھتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں۔" مثلاً گھروں کی تعمیر کا مسئلہ؛ یعنی ایسی رہائش گاہیں جو بڑے پیمانے پر، تیزی سے، کم قیمت اور مضبوط بنیادوں پر تعمیر کی جائیں۔ یا پھر زراعت کا مسئلہ۔ آپ نے ان کے نوروزی پیغام[1] میں بھی دیکھا ہو گا کہ انہوں نے لکھا تھا کہ میرے پاس ایک اقتصادی منصوبہ ہے جس پر کام کیا گیا ہے۔

ایک اور چیز جو کئی سال پہلے سے متعلق ہے، وہ ثقافت کے موضوع پر ان کی ایک تفصیلی تحقیقی کاوش ہے۔ بظاہر انہوں نے رہبرِ انقلاب کی خدمت میں ثقافتی امور کے حوالے سے کچھ تجاویز پیش کی تھیں، جس کے بعد آقا نے انہیں ذمہ داری دی کہ وہ ثقافت کے مسئلے پر ایک جامع تحقیق کریں۔ چنانچہ انہوں نے ابتدا سے ایک مفصل رسالہ تیار کیا؛ یعنی ثقافت کی تعریف سے لے کر ہمارے معاشرے میں موجود ثقافتی ڈھانچوں تک، جیسے حوزۂ علمیہ، نظامِ تعلیم و تربیت، ذرائع ابلاغ اور دیگر اداروں کے مقام اور کردار وغیرہ۔

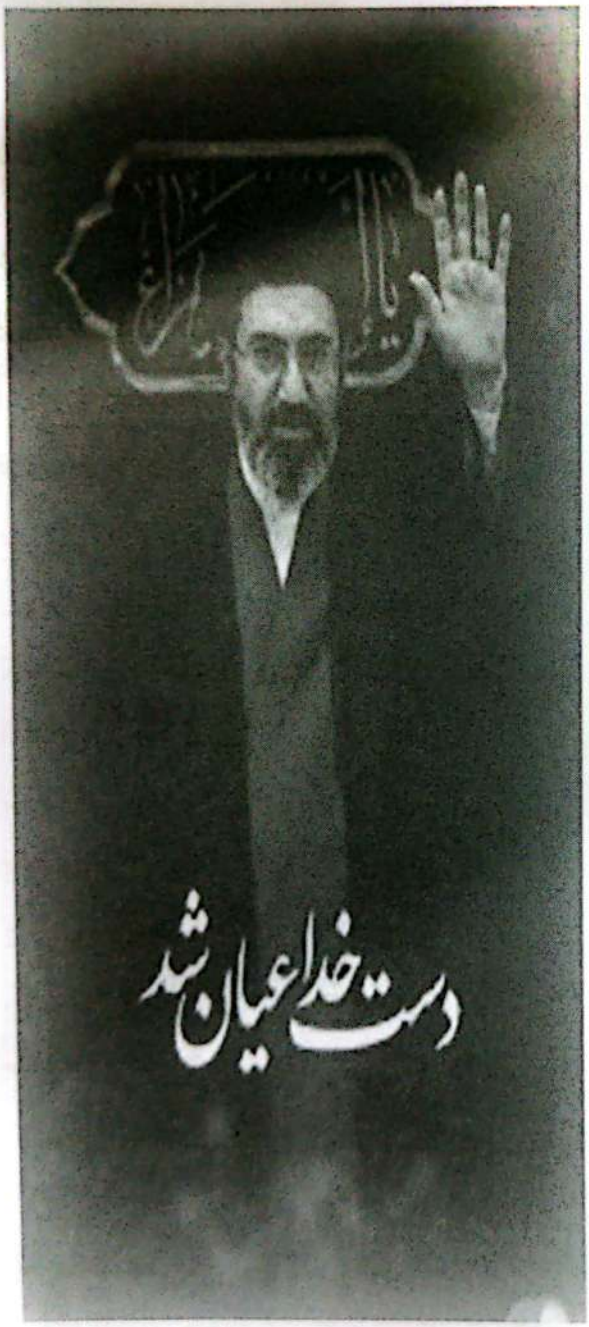
---

(۱) "ان سیکھنے، سننے اور دیگر مطالعات کے نتیجے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ایک ایسی مؤثر اور ماہرین کی بنیاد پر تیار شدہ اصلاحی تدبیر مرتب کی جائے جو حتی الامکان جامع پہلوؤں کی حامل ہو۔ بحمد اللہ یہ کام ایک قابلِ قبول حد تک مکمل ہو چکا ہے، اور عنقریب بلند ہمت ذمہ داران کی جانب سے پوری قوم کے تعاون کے ساتھ اس پر عمل درآمد ہو گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔" (رہبرِ انقلاب کا سال ۱۴۰۵ ہجری شمسی کے آغاز کے موقع پر نوروزی پیغام)

خط: کیا آپ کو ان کی قوتِ ارادی، دوراندیشی یا روشن بصیرت کے حوالے سے کوئی واقعات یاد ہیں؟

کچھ واقعات مجھے یاد ہیں، لیکن یہ واقعہ بہت واضح ہے۔ جب داعش کی حکومت کے خاتمے کا اعلان ہوا اور شام آزاد ہوا تو ایک دوست، جو آقا مجتبیٰ کے ساتھ ہمارے رابطے میں تھے، نے بیان کیا: "ہم اس وقت بہت خوش تھے، لیکن جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا: شام ایسی ماچس کی تیلیوں کی مانند ہے جو ایک دوسرے کے اوپر رکھی گئی ہوں؛ یعنی انتہائی کمزور اور متزلزل ہے، جو ایک پھونک سے گر کر بکھر جائے گا۔"

پھر آپ نے دیکھا کہ وہ کس قدر ناپائیدار[1] ثابت ہوا! یہ ان کی گہری بصیرت، حالات پر مکمل گرفت اور مستقبل بینی کی علامت



انہوں نے فرمایا: "ملکِ شام ایسی ماچس کی تیلیوں کی مانند ہے جو ایک دوسرے کے اوپر رکھی گئی ہوں؛ یعنی یہ بہت زیادہ کمزور اور متزلزل ہے اور ایک پھونک سے گر کر بکھر جائے گا۔"

ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کی توجہ یمن کی طرف تھی۔ لفظ "حوثی" میں نے پہلی مرتبہ انہی سے سنا تھا۔ وہ حوثیوں اور ان کی استقامت کی تعریف اور تحسین کیا کرتے تھے۔

خط: کیا یہ توجہ روایات کی وجہ سے تھی؟

مجھے معلوم نہیں، لیکن وہ روایاتِ آخر الزمان پر کام کر چکے تھے اور اس موضوع پر ان کی گہری دسترس تھی۔

---

(۱) داعش کی حکومت کے خاتمے اور شام کے وسیع علاقوں کی آزادی کے سات سال بعد، جو ۲۰۱۷ء میں آزاد ہوا تھا، دسمبر ۲۰۲۴ء میں شام کی مستقر حکومت کا سقوط ہوا اور اقتدار ایک تکفیری دہشت گرد گروہ کے ہاتھ میں چلا گیا، جس کی سربراہی احمد الشرع (ابو محمد الجولانی) کر رہے تھے۔



قم بنیادی مرکز ہے!

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی علمی و عملی سیرت

حجت الاسلام جواد اکبری

انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے شاگرد حجت الاسلام والمسلمین محمد جواد اکبری سے گفتگو

خط: آپ کس سال سے آیت اللہ خامنہ ای کے درس میں حاضر ہوئے تھے؟

ابتدا میں حضرت استاد نے ۲۰۱۰ء میں باقاعدہ طور پر درسِ خارجِ فقہ اور اصول کا آغاز کیا۔ وہ شاگرد جنہوں نے ان کے یہاں سطوحِ عالیہ پڑھی تھی، ان کلاسوں کا بنیادی حلقہ تھے۔ درس ایک چھوٹے سے کمرے میں، تقریباً پندرہ مربع میٹر کے رقبے میں منعقد ہوتا تھا اور حاج آقا ایک سادہ سی چٹائی پر زمین پر بیٹھتے تھے۔ میں ۲۰۱۱ء میں ایک دوست کے مشورے سے اس درس میں شامل ہوا، جبکہ اس سے پہلے بڑے اساتذہ کے درسِ خارج میں شرکت کا تجربہ رکھتا تھا۔ چند ہی جلسوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ان کے تدریس کا انداز ان تمام چیزوں سے بالکل مختلف ہے جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ اکثر درسِ خارج میں استاد گفتگو کرتے ہیں اور طلبہ صرف سنتے ہیں، لیکن حاج آقا کے درس میں معاملہ بالکل دو طرفہ تھا۔ وہ طلبہ کو پابند کرتے تھے کہ ہر مسئلے کے آغاز سے پہلے اس پر تحقیق کریں اور اسے پیش کریں۔ پہلی مرتبہ مجھے اچانک «ماءُ المطر»[1] کا موضوع پیش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا، جبکہ اس سے پہلے مجھے درسِ خارج میں ارایہ کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ مجھے مجبوراً تمام اقوال، دلائل، روایات اور ممکنہ اشکالات کا جائزہ لینا پڑا تاکہ میں اپنے موقف کا دفاع کر سکوں۔ پیش کرنے کے دن استاد اور طلبہ آزادانہ طور پر اعتراض کرتے تھے؛ سندی اشکال سے لے کر روایت کے ظہور یا منتخب دلیل پر نقد تک۔ یہ سلسلہ کبھی کبھی دو یا تین جلسوں تک جاری رہتا تھا۔

درس کا ماحول علمی مقابلے والا، لیکن ساتھ ہی دوستانہ بھی تھا۔ سب کوشش کرتے تھے کہ علمی بحث میں ایک دوسرے کو چیلنج کریں۔ میں کہا کرتا تھا کہ حاج آقا کا ایک سال کا درس میرے لیے دوسروں کے کئی سال کے درس کے برابر تھا؛ کیونکہ پہلی مرتبہ یہاں مجھے حقیقتاً درسِ خارج پیش کرنے کا طریقہ سیکھنے کو ملا۔ خود وہ بھی ہر ایک کی پیشکش کے بعد ہمیں اپنی رائے دیتے تھے اور فرماتے تھے: "آپ کی اگلی پیشکش اس سے بہتر ہوگی؛ کیونکہ پیش کرنے کے بعد آپ پہلے جیسے انسان نہیں رہتے۔" جب کلاس میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی تو پیش کرنے کا طریقہ گروہی صورت اختیار کر گیا، لیکن یہ طریقہ بدستور درس کا بنیادی محور باقی رہا۔

خط: کیا یہ طریقۂ تدریس ان کی نگرانی میں چلنے والے تعلیمی اداروں اور نچلے تعلیمی مراحل میں بھی نافذ کیا گیا تھا؟

یہ طریقۂ تدریس نہایت مؤثر ثابت ہوا، اور ہمیں محسوس ہوا کہ حوزہ کے ابتدائی اعلیٰ مراحل، جیسے رسائل، مکاسب اور کفایہ کے دروس میں بھی اس کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم نے تجویز پیش کی کہ

---

(۱) بارش کا پانی؛ فقہی مباحث کے عنوانات میں سے ایک عنوان۔

یہ نظام ان مدارس میں بھی نافذ کیا جائے جو ان کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ انہوں نے ہدایت فرمائی کہ یہ طریقۂ کار مکاسب، رسائل اور کفایہ جیسی کتابوں میں بھی نافذ کیا جائے۔ یہ دروس اصل درس سے پہلے «راہنما درس» کے عنوان سے منعقد ہوتے تھے۔ ان راہنما درسوں میں طلبہ خود مباحث پیش کرتے تھے۔ ان پر لازم تھا کہ دیگر کتابوں کا بھی مطالعہ کریں، شیخ انصاری یا آخوند خراسانی کے استدلالات کا جائزہ لیں، اور ان پر اٹھائے جانے والے اعتراضات سے بھی واقف ہوں۔ مقصود یہ تھا کہ طلبہ درسِ خارج میں داخل ہونے سے پہلے آرا پر تنقید کے طریقۂ کار، مباحث میں صحیح انداز سے داخل ہونے اور ان سے نتیجہ اخذ کرنے کے اصول، اور اعلیٰ سطح کے دروس میں شرکت کے لیے ضروری علمی آمادگی حاصل کر لیں۔

خط: کلاس میں طلبہ کی تعداد کس طرح بڑھتی گئی؟

وہ ہرگز اجازت نہیں دیتے تھے کہ نئے تعلیمی سال کے آغاز پر درس کے بارے میں کوئی اعلان یا بینر جاری کیا جائے؛ برخلاف اس معمول کے جس میں اساتذہ اپنے درس کا مقام اور موضوع پہلے سے اعلان کر دیتے ہیں۔ درس کی وسعت صرف ایک قدرتی طریقے سے ہوتی تھی، یعنی زبان بہ زبان۔ ایک شاگرد دوسرے شاگرد کو اطلاع دیتا، اور اسی طرح ہر سال درس میں شریک ہونے والوں کی تعداد تقریباً دوگنی ہو جاتی تھی۔ ۲۰۱۶ء اور ۲۰۱۷ء تک شرکا کی تعداد تقریباً پانچ سو تک پہنچ گئی، جس کے بعد درس کو قم میں دفتر رہبری کے حسینیہ میں منتقل کر دیا گیا۔

حاج آقا بدستور اسی سادہ انداز میں، ایک سادہ کمبل پر بیٹھ کر اور ایک چھوٹی سی میز کے پیچھے درس دیتے تھے۔ انہی درسی نشستوں کی بعض تصاویر، جن میں طلبہ فریم میں شامل نہیں تھے، کبھی کبھار سوشل میڈیا پر تمسخر کا نشانہ بنتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کسی بھی تصویر کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے تھے، بلکہ اگر کوئی بالواسطہ طور پر بھی انہیں شائع کرنا چاہتا تو اس سے بھی منع فرما دیتے تھے۔ کورونا وبا کے زمانے میں، جب دروس آن لائن ہو گئے، طلبہ کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۱۳۰۰ تک پہنچ گئی۔

یہاں تک کہ بعض شاگردوں نے دروس کو کتابی شکل دینے کی بھی کوشش کی، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ انہوں نے مرتب اور اشاعت کے لیے تیار چند جلدیں، جو دروس کی تقریرات پر مشتمل تھیں، حاج آقا کی خدمت میں پیش کیں، لیکن انہوں نے اشاعت کی اجازت نہ دی، بلکہ فرمایا کہ اگر یہ شائع بھی کر دی جائیں تو وہ ان کی نسبت اپنی طرف قبول نہیں کریں گے۔ اصولاً وہ درسی مباحث کو ذرائع ابلاغ کے ذریعے نشر کرنے کے مخالف تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ درسِ خارج کو اسی حضوری علمی ماحول میں، اور سنجیدہ حوزوی طلبہ کے درمیان جاری رہنا چاہیے۔

خط: مشہور ہے کہ وہ فقہ اور اصول کے علاوہ درسِ تفسیر بھی دیتے تھے۔ اس درس کی داستان بھی بیان فرمائیں۔

یہ درس انہوں نے حاج آقا قرائتی کے مشورے پر شروع کیا تھا۔ اصول کے مباحث کے اختتام کے بعد حضرت استاد تقریباً پندرہ منٹ قرآنِ کریم کی تفسیری نکات بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس درس کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا آغاز تھا۔ وہ کبھی بھی یک طرفہ طور پر خود یہ طے نہیں کرتے تھے کہ کون سی سورت زیرِ بحث آئے گی، بلکہ حاضرین سے رائے طلب کرتے تھے تاکہ درس کے لیے سورت کا انتخاب باہمی مشورے سے ہو۔ یہی طرزِ عمل ابتدا ہی سے درس کے ماحول کو استاد کی تواضع اور طلبہ کی مشارکت کے جذبے سے آراستہ کر دیتا تھا۔

مباحث کا بڑا حصہ اخلاقی رنگ لیے ہوتا تھا۔ استاد اس بات پر زور دیتے تھے کہ قرآنِ کریم کی آیات، اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور انہیں عبرت و نصیحت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اسی لیے بعد میں

اس درس کے جو حصے متفرق طور پر شائع ہوئے، ان میں بھی زیادہ تر تربیتی پہلو اور اخلاقی نصیحتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

نماز پر ان کی خصوصی توجہ کے باعث، ان دروس کا ان طلبہ کی نماز پر نمایاں اثر پڑتا تھا جو درس میں سنجیدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

خط: وہ کئی برس تک ہر روز تہران سے قم آتے جاتے رہے؛ قم میں دو گھنٹے درس دیتے اور پھر واپس لوٹ جاتے تھے، جبکہ یہ ایک نہایت دشوار کام تھا۔ اس طرزِ عمل کے پیچھے ان کا کیا مقصد تھا؟ وہ تہران میں درس کیوں نہیں دیتے تھے؟

ان کے نزدیک «قم ایک بنیادی علمی مرکز تھا۔ ان کا خیال تھا کہ تہران کے طلبہ، قم کے طلبہ کی طرح مکمل طور پر درس و تحقیق میں منہمک نہیں رہ سکتے۔ خود وہ بھی سطوحِ عالیہ کی تکمیل تک تہران ہی میں رہے، لیکن درسِ خارج کے لیے قم تشریف لے آئے؛ کیونکہ ان کا احساس تھا کہ تہران میں وہ اس طرح تعلیم حاصل نہیں کر سکیں گے جس طرح کرنی چاہیے۔ تہران میں فاصلے بہت زیادہ ہیں، ٹریفک شدید ہے، اور اہم دروس تک آسانی سے آمد و رفت ممکن نہیں۔ تدریس کے اعتبار سے بھی اگر وہ تہران میں درس دیتے تو غالباً ان کا درس صرف دفتر یا اس کے اطراف ہی محدود رہتا، اور مختلف پابندیوں کے باعث ایک پررونق اور کثیر تعداد پر مشتمل علمی درس تشکیل نہیں پا سکتا تھا۔ اس کے برعکس قم کا ماحول بالکل مختلف تھا۔ حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا کے روضۂ مبارک کے قرب میں ہونا ان کے نزدیک خصوصی اہمیت رکھتا تھا، اور حضرت معصومہ سلام اللہ علیہا سے انہیں گہری عقیدت و محبت تھی۔ اس کے علاوہ قم میں علمی نشاط اور تحقیقی فضا زیادہ پائی جاتی ہے، اس لیے وہ درسِ خارج کے لیے اسے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ ممکن ہے تہران میں ان کی جانب سے عوامی درس منعقد نہ کرنے کی ایک وجہ حضرت آقا کے درس کا احترام بھی ہو۔ البتہ یہ سنا گیا ہے کہ تہران میں وہ بعض خصوصی دروس دیتے تھے، لیکن عوامی درس نہیں دیتے تھے۔

خط: بظاہر قم میں وہ علمی سرگرمیوں کے علاوہ دیگر خدمات بھی انجام دیتے تھے، اور اب رفتہ رفتہ ان میں سے بعض سرگرمیاں سامنے آ رہی ہیں۔ ان سرگرمیوں کے بارے میں کچھ بتائیے۔

حاج آقا کے شاگردوں کی اہم سرگرمیوں میں سے ایک قم میں غربا اور ضرورت مندوں کی نشاندہی کرنا اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنا تھا۔ جو بھی شخص مدد یا مالی اعانت کے لیے حضرت آقا کے دفتر سے رجوع کرتا، اس کی فائل حاج آقا کے شاگردوں کے حوالے کر دی جاتی۔

> **انہی درسی نشستوں کی بعض تصاویر، جن میں طلبہ فریم میں شامل نہیں تھے، کبھی کبھار سوشل میڈیا پر تمسخر کا نشانہ بنتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ کسی بھی تصویر کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے تھے۔**

انہوں نے طلبہ، اپنے معتمد احباب اور قابلِ اعتماد افراد پر مشتمل ایک بڑا گروہ تشکیل دیا تھا، تاکہ وہ قم اور اس کے اطراف کے مختلف علاقوں، مثلاً جعفریہ، کہک، قمرود، قنوات، نیز شہر کے مختلف محلّوں جیسے نیروگاہ، شیخ آباد، امامزادہ سید معصوم، آذر اور خاکفرج میں جا کر ضرورت مند خاندانوں کی صورتِ حال کا جائزہ لیں۔

ان کی تاکید تھی کہ کسی بھی درخواست کو تحقیق کے بغیر نظر انداز نہ کیا جائے۔ درخواست گزار کا پتہ، رابطہ نمبر اور خاندانی حالات درج کیے جاتے، پھر تحقیقاتی ٹیمیں موقع پر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیتیں۔ اگر خاندان کی سربراہی کسی خاتون کے پاس ہوتی تو خواتین پر مشتمل ٹیم بھیجی جاتی۔ غرض ہر جگہ حالات کے مطابق مناسب افراد کو روانہ کیا جاتا، تاکہ لوگوں کی عزتِ نفس اور آبرو محفوظ

رہے۔ بہت سے خاندان شدید مشکلات کا شکار تھے؛ کہیں بیٹیوں کے جہیز کا مسئلہ تھا، کہیں فریج یا واشنگ مشین جیسی بنیادی ضروریات کی کمی، اور کہیں مالی مشکلات، مثلاً قسطوں کی عدم ادائیگی کے باعث گھر ضبط ہونے کا خطرہ۔

تحقیقاتی ٹیم ضرورت مند مریضوں کے علاج کے لیے بھی فوری اقدامات کرتی تھی۔ بعض افراد کے پاس دوائیں خریدنے، انجیکشن لگوانے یا ڈاکٹر سے رجوع کرنے کی بھی استطاعت نہیں ہوتی تھی۔ بعض اوقات درمان گاہِ قرآن و عترت جیسے طبی مراکز سے رابطہ کیا جاتا تاکہ دندان سازی کی خدمات قرض کی بنیاد پر فراہم کی جاسکیں۔ اخراجات کا ایک حصہ حضرت آقا کے دفتر سے پورا کیا جاتا اور باقی عوامی عطیات سے فراہم ہوتا تھا۔ حاج آقا عوامی تعاون کو نہایت قیمتی سمجھتے تھے اور ہمیشہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ تمام امداد ضرورت مندوں کی عزت و وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہنچائی جائے۔ حتیٰ کہ نوروز کے موقع پر جو امدادی کوپن حضرت آقا کے دفتر کے نام سے تقسیم کیے جاتے تھے، ان میں سے تقریباً سب حاج آقا مجتبیٰ ہی تیار کرواتے تھے، اگرچہ ان کا نام کہیں ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔

وہ اس بات پر اصرار کرتے تھے کہ تمام امداد حضرت آقا کے نام سے دی جائے اور ان کا اپنا نام ہرگز سامنے نہ آئے۔ یہاں تک کہ بہت سے مواقع پر دفترِ رہبری کی طرف سے کوئی خرچ نہیں ہوتا تھا، بلکہ یہ امداد یا تو وہ خود فراہم کرتے تھے یا ان مخیر حضرات کے ذریعے جنہیں وہ جانتے تھے۔

خط: قدرتی آفات کے دوران آپ کے درس کے طلبہ کے لیے جہادی سرگرمیاں کس طرح منظم کی جاتی تھیں؟

اہم نکات میں سے ایک یہی جہادی روح تھی۔ حاج آقا ہمیشہ جوانی کے زمانے میں حضرت آقا کی سیرت کی طرف اشارہ فرمایا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انقلاب سے پہلے ایرانشہر کے سیلاب کے موقع پر حضرت آقا نے کسی سرکاری ادارے کے اقدام کا انتظار کیے بغیر خود میدانِ عمل میں قدم رکھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں بھی انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر جب بھی گلستان میں سیلاب، آذربائیجان میں زلزلہ یا خوزستان میں سیلاب جیسی قدرتی آفات پیش آتیں، تو قم سے طلبہ کے امدادی قافلے روانہ کیے جاتے تھے۔ اگر یہ واقعات تعلیمی سال کے دوران بھی پیش آتے، تب بھی درس معطل کر دیا جاتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے: "لوگ مصیبت میں ہیں؛ درس بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔"

جب بھی سیلاب، زلزلے یا اس نوعیت کی کوئی آفت پیش آتی تو قم سے طلبہ کو امدادی خدمات کے لیے روانہ کیا جاتا۔ ایسے مواقع پر درس معطل کر دیا جاتا اور فرمایا کرتے تھے: "لوگ اس وقت مصیبت میں ہیں؛ درس تو بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔"

خط: کورونا کے زمانے میں صورتِ حال کیسی تھی؟

کورونا کا زمانہ اس جہادی جذبے کی معراج تھا۔ طلبہ مدرسے میں پھلوں کا رس اور کھانا تیار کرتے اور ایسے مریضوں کی خدمت میں مصر وف رہتے جن کا کوئی سرپرست نہ تھا۔ جب یہ اطلاع ملی کہ بعض کورونا سے وفات پانے والوں کو غسل دیے بغیر دفن کیا جا رہا ہے، تو حاج آقا نے ہدایت فرمائی کہ خود طلبہ اس ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیں۔ اس کے بعد باقاعدہ تربیت یافتہ ٹیمیں تشکیل دی گئیں، جو شب و روز بہشتِ معصومہ میں اس خدمت کو انجام دیتی رہیں۔ حاج آقا کے نزدیک وہی حوزہ زندہ ہے جو لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو؛ ان کے غم و خوشی، مشکلات اور مصائب میں ان کا شریک ہو۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ جو حوزہ عوام سے کٹ جائے، وہ مردہ حوزہ ہے، اور درس کی برکت لوگوں کی خدمت کے ساتھ وابستہ ہے۔

خط: ہم نے ان کی سادہ زندگی کے بارے میں بڑی عجیب و غریب باتیں سنی ہیں۔ اس حوالے سے بھی اگر کچھ بیان فرمائیں؟

حاج آقا مجتبیٰ کی آمد و رفت ہمیشہ ایک پژو ۴۰۵ میں ہوتی تھی، جس کے ساتھ صرف ایک ڈرائیور اور ایک محافظ ہوتا تھا۔ نہ کوئی حفاظتی ٹیم ہوتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کے تکلفات۔ سڑک پر بھی کوئی انہیں پہچان نہیں پاتا تھا۔ حاج آقا مصطفی بھی پرائیڈ گاڑی استعمال کرتے تھے اور نہایت سادہ انداز میں، کم سے کم وسائل کے ساتھ سفر کرتے تھے۔

لباس کے معاملے میں بھی وہ کبھی اعلیٰ درجے کے مخصوص حوزوی ملبوسات استعمال نہیں کرتے تھے، بلکہ رہبرِ انقلاب کے استعمال شدہ لباس پہن لیتے تھے، اور خود نئے کپڑے اس وقت تک نہیں خریدتے تھے جب تک پرانے کپڑے مکمل طور پر بوسیدہ نہ ہو جائیں۔

یہ سادگی اخراجات میں بھی نمایاں تھی۔ ان کی درسی ویب سائٹ پر ابتدائی لاگت تقریباً چھ لاکھ تومان آئی تھی۔ جب زیادہ بہتر ویب سائٹ بنانے کے لیے سالانہ پانچ سے چھ ملین تومان خرچ کی تجویز دی گئی تو انہوں نے فرمایا: "میرے پاس اس کے لیے رقم نہیں ہے۔"

کورونا کے زمانے میں بھی مجازی دروس کے لیے ضروری انٹرنیٹ خریدنے سے صرف اس لیے گریز کیا کہ اس پر خرچ آتا تھا، کیونکہ وہ بیت المال کو اپنی ذاتی ضرورت کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ حسینیہ کے چائے، چینی، بسکٹ، حتیٰ کہ بجلی کے اخراجات بھی وہ اپنی ذاتی جیب سے ادا کرتے تھے تاکہ بیت المال کے استعمال میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

سادہ ایرانی جوتے پہننا اور بے تکلف طرزِ زندگی صرف انہی کی خصوصیت نہیں تھی، بلکہ رہبرِ انقلاب کے تمام فرزند اسی طرزِ زندگی پر عمل پیرا تھے۔ رہبرِ انقلاب کے چاروں صاحبزادے کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور ان کی اپنی ذاتی رہائش نہیں تھی۔

ان کے لباس اور طرزِ زندگی کے بارے میں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ سردیوں میں وہ برسوں تک وہی ایک سویٹر پہنتے رہے، جو پندرہ سال کے عرصے میں کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ ان کی قبائیں اور عبائیں بھی بار بار وہی رہتی تھیں۔ پندرہ برس کے دوران شاید صرف ایک مرتبہ انہیں نئی قبا میں دیکھا گیا۔ ان کے لباس تقریباً ہمیشہ ایک جیسے رہتے تھے اور وہ کبھی نئے یا مختلف لباس یا جوتوں کے ساتھ نظر نہیں آتے تھے۔

وہ اور ان کے اہلِ خانہ، جو تہران کے ایک مدرسے کے منتظم تھے، زیادہ تنخواہ لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر انہوں نے اپنی تنخواہ کے لیے خود ایک حد مقرر کر رکھی تھی۔ مثال کے طور پر، مقررہ تنخواہ کا صرف ایک چوتھائی یا ایک پانچواں حصہ وصول کرتے تھے تاکہ عوام کے حالات سے باخبر رہیں اور ان کی زندگی عام لوگوں کے معیار کے قریب رہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ذمہ دار شخص کو آسودہ اور پُرتعیش زندگی نہیں گزارنی چاہیے، تاکہ وہ عوام کے دکھ درد کو صحیح معنوں میں سمجھ سکے۔

خط: رہبری کی شرائط میں سے ایک شجاعت بھی بیان کی جاتی ہے۔ آپ نے اپنے مشاہدے یا سنی ہوئی باتوں کی روشنی میں ان کی شجاعت کے بارے میں کیا دیکھا یا سنا ہے؟

شجاعت کے حوالے سے، اگرچہ دفاعِ مقدس کے کمانڈروں کی یہ شدید خواہش تھی کہ حاج آقا مجتبیٰ اور حاج آقا مصطفی کو محاذِ اوّل پر نہ بھیجا جائے، لیکن حضرت آقا نے فرمایا تھا: اگر وہ خود جانا چاہیں تو کوئی ممانعت نہیں؛ البتہ اسیر نہ ہوں تاکہ نظام کو ان کی وجہ سے کسی قسم کی مشکل پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ اس کے باوجود، دونوں حضرات حبیب بن مظاہر بٹالین کے ساتھ محاذِ جنگ کی اگلی صفوں پر گئے۔

نقل کیا جاتا ہے کہ حاج آقا مجتبیٰ، پلٹون کمانڈر کی مخالفت کے باوجود، اپنے اصرار اور لشکر (ڈویژن) کے کمانڈر، شہید

شمخانی کی سفارش سے محاذ کی اگلی صفوں پر جانے میں کامیاب ہوئے۔

اسی طرح ہمارے فوجی کمانڈروں کی ٹارگٹ کلنگ کے ردِّعمل میں ان کا موقف یہ تھا کہ دشمن کو ایک دوٹوک اور فیصلہ کن پیغام دیا جانا چاہیے، اور اسے ہرگز جھوٹا احساسِ تحفظ نہیں ملنا چاہیے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دشمن کی جارحیت کا جواب اسی شدت کے ساتھ دیا جانا چاہیے۔

مزاحمت کے جذبے کو مضبوط بنانے کے لیے وہ یہ بھی سفارش کرتے تھے کہ سکیورٹی اور عسکری قوتوں کو یمن اور لبنان جیسے علاقوں میں بھیجا جائے تاکہ وہ مزید تجربہ حاصل کریں۔ انہیں یمنی عوام کی غیر معمولی شجاعت پر واقعی گہرا یقین تھا۔ مزاحمتی محاذ کے قائدین، جیسے سید بدرالدین الحوثی، شیخ نعیم قاسم، سید ہاشم حیدری اور شیخ اکرم الکعبی، ان سب کا اس سے پہلے ہی ان کے ساتھ رابطہ اور تعلق رہا تھا۔

خط: اس مناسبت سے اگر محورِ مقاومت کے ساتھ ان کے روابط کو بھی مختصراً بیان فرمائیں؟

حاج آقا مجتبیٰ کا مزاحمتی محور کے ساتھ تعلق نہایت گہرا اور وسیع تھا۔ مزاحمتی محاذ کے رہنماؤں، جیسے سید بدرالدین الحوثی، شیخ نعیم قاسم، سید ہاشم الحیدری اور شیخ اکرم الکعبی، سب کے ساتھ پہلے ہی سے ان کے روابط قائم تھے اور حکمتِ عملیوں میں ہم آہنگی کے لیے متعدد نشستیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔

مزاحمتی محاذ ان سے مکمل واقفیت رکھتا تھا، اور حاج آقا بھی اس محاذ کے نہایت باریک اور جزوی مسائل سے آگاہ رہتے تھے۔ اس حوالے سے انہیں رہبرِ معظم انقلاب کے نزدیک بھی خاص مقام حاصل تھا؛ یہاں تک کہ رہبرِ شہید نے فرمایا تھا: "آقا مجتبیٰ کی بات میری بات ہے"، اور نظریاتی اعتبار سے انہیں اپنے سب سے قریب افراد میں شمار کرتے تھے۔

یہ فکری قربت صرف عسکری مسائل تک محدود نہیں تھی، بلکہ ثقافتی موضوعات میں بھی نمایاں تھی۔ البتہ اقتصادی مسائل میں وہ براہِ راست مداخلت نہیں کرتے تھے اور لوگوں کی حکومت اور متعلقہ اداروں کی طرف رہنمائی کرتے تھے۔

خط: یعنی اقتصادی مسائل میں ان کی کوئی رائے نہیں تھی؟

نہیں، وہ اقتصادی مسائل میں بھی صاحبِ نظر تھے اور وہ پیٹرول، چاول، تیل، روٹی اور گوشت جیسی بنیادی اور اسٹریٹجک اشیائے ضروریہ کے کنٹرول پر زور دیتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ان عمومی استعمال کی اشیا کی قیمتوں میں شدید اتار چڑھاؤ براہِ راست پورے معاشرے کو متاثر کرتا ہے، اس لیے حکومت کو ان کی قیمتوں پر نگرانی اور کنٹرول رکھنا چاہیے۔ وہ ترقی یافتہ ممالک میں ان اشیا کی قیمتوں کے استحکام کی مثال دیتے تھے کہ عالمی سطح پر مہنگائی کے باوجود انہوں نے ضروری اشیا کی قیمتوں کو بڑی حد تک مستحکم رکھا، تاکہ عوامی بے اطمینانی اور سماجی بے چینی سے بچا جا سکے۔ ان کے مطابق مہنگائی کا دباؤ زیادہ تر معاشرے کے کمزور طبقات پر پڑتا ہے، جبکہ خوش حال طبقات کی آمدنی بھی مہنگائی کے ساتھ بڑھ جاتی ہے۔





آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے فقہی نظریات میں تقیہ کے مقام کا ایک آزادانہ جائزہ

محمد جواد اکبری

یادداشت

تقیہ کا موضوع سیاست، علم اور ہدایت کی پیچیدہ تہوں کو آشکار کرتا ہے۔ اس بحث میں ایک بنیادی نکتہ جو نمایاں ہوتا ہے، وہ بنیادی فقہی مسائل اور سیاسی امور میں تقیہ کے درمیان فرق ہے۔ استاد آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کا نظریہ یہ تھا کہ بنیادی طور پر تقیہ کے مفہوم کی تشکیل کا پس منظر سیاسی اور حکومتی حالات تھے۔ مثال کے طور پر امام رضا علیہ السلام کا مامون کو «امیر المؤمنین» کے عنوان سے خطاب کرنا سیاسی تقیہ کی ایک واضح مثال ہے؛ کیونکہ شیعہ روایات میں یہ تعبیر صرف ایک ہی شخصیت، یعنی امیر المؤمنین علی علیہ السلام، کے لیے مخصوص ہے۔ یہ اقدام کسی شرعی حقیقت کے اظہار کے طور پر نہیں تھا، بلکہ عباسی حکومت کی حساسیت کو کم کرنے اور ظاہری سیاسی مصلحت کو برقرار رکھنے کے لیے ایک تدبیر تھی، تاکہ دشوار حالات میں سلسلۂ امامت کا راستہ جاری رہ سکے۔ یہ طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام سیاسی اور حفاظتی دباؤ کے ماحول میں اصل دین اور خطِ امامت کی بقا کے لیے بعض مصلحتی حکمتِ عملی اختیار کرتے تھے؛ ایسی حکمتِ عملیاں جن کی نوعیت سیاسی تھی، نہ کہ فقہی یا اعتقادی۔

اس کے برخلاف بنیادی فقہی مسائل میں ائمہ علیہم السلام نہ صرف خاموشی اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ فعال طور پر احکام بیان فرماتے تھے اور اپنے زمانے کے خلفاء کے فقہی سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے۔ اس کی ایک نمایاں مثال مامون کا امام جواد علیہ السلام سے چوری کی حد کے بارے میں استفتاء ہے۔ مامون نے ایک خط میں امام سے سوال کیا کہ قرآن کریم کی اس آیت: «وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا»[1] میں «ید» سے کیا مراد ہے؟ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے؟ بعض فقہا کہتے تھے کہ کندھے سے کاٹا جائے، بعض کہنی سے، بعض بازو سے اور بعض کلائی سے۔

امام جواد علیہ السلام، جو اس وقت اپنے والد بزرگوار کی شہادت کے بعد مدینہ میں موجود تھے، نے مامون کے جواب میں آیتِ کریمہ: «وَأَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلَّهِ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللَّهِ أَحَدًا»[2] سے استدلال فرمایا۔ حضرت کا استدلال یہ تھا کہ سجدے کے اعضاء (مساجدِ سبعہ)، جن میں ہتھیلیاں بھی شامل ہیں، عبادتِ خدا کے لیے باقی رہنے چاہئیں؛ لہٰذا ہاتھ اس طرح کاٹا جائے کہ یہ اعضا محفوظ رہیں۔ یہ مثال اور اس جیسے دیگر شواہد اس تصور کے خلاف ہیں کہ گویا تمام فقہی مسائل میں تقیہ جاری تھا۔ تقیہ بنیادی طور پر ایک سیاسی اور حکومتی امر تھا، جسے ضرورت کے مواقع پر امام کی جان اور حق کے محاذ کے وجود کی حفاظت کے لیے ایک حکمتِ عملی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن واضح طور پر احکام اور بنیادی فقہی مسائل کے بیان کے میدان میں ائمہ علیہم السلام نے بہت سے مواقع پر صراحت اور وضاحت کے ساتھ اپنا موقف بیان فرمایا ہے۔

---

(۱) سورۂ مبارکہ مائدہ، آیت ۳۸

(۲) سورۂ مبارکہ جن، آیت ۱۸



قرآن وروایات کا خدا، وہی فقہ واصول کا خدا ہے

حجت اسلام رضا علی آبادی

انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی فقہی، اصولی اور کلامی فکر کی ساخت؛
حجت الاسلام والمسلمین رضا علی آبادی کے ساتھ گفتگو

خط: آپ آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ خارجِ فقہ واصول سے کیسے آشنا ہوئے؟

تقریباً آٹھ، نو سال پہلے کی بات ہے۔ ہم نے حوزۂ علمیہ قم میں مختلف اساتذہ کے دروسِ خارج دیکھے تھے اور الحمدللہ اس میدان میں اچھے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا، جیسے مرحوم آیت اللہ ہاشمی شاہرودی اور دیگر اساتذہ۔ لیکن ہمیشہ ہمارے ذہن میں کچھ سوالات اور خلشیں موجود رہتی تھیں۔ مثلاً علمِ اصول کا قرآن کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ علمِ اصول کا علمِ کلام سے کیا رشتہ ہے؟ اور اصول کا فقہ کے ساتھ حقیقی ارتباط کیا ہے؟ بالخصوص ہم جو کتاب کفایہ پڑھاتے تھے، ہمارے لیے یہ مسائل زیادہ نمایاں تھے۔ فقہ میں داخل ہوتے وقت محسوس ہوتا تھا کہ اصولی مبانی میں سے بہت سے مباحث آسانی کے ساتھ ایک طرف رکھ دیے جاتے ہیں؛ گویا اصولی بحث کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ہمیں احساس ہوتا تھا کہ ہماری اسلامی علوم کے درمیان وہ ایک مرکزی ربط موجود نہیں جسے سب کو آپس میں جوڑنے والا دھاگا کہا جاسکے۔ یہی فکر اور تشنگی ہمارے ذہن میں موجود تھی، یہاں تک کہ ہم حضرت استاد کے درس سے آشنا ہوئے۔

وہ توجہ، جو محض درس اور متن سے آگے بڑھ کر تھی، ہمارے لیے نہایت دلکش اور اثر انگیز تھی۔ مثلاً کبھی کبھی وہ حضرت آیت اللہ بہجت کا کوئی ارشاد نقل فرماتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کا آیت اللہ بہجت کے ساتھ کس قدر گہرا رابطہ اور تعلق رہا ہے۔ تاہم وہ خود فوراً یہ وضاحت بھی فرما دیتے تھے کہ: "ایسا نہ سمجھیں کہ ہمارا ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق تھا۔" یہ ان کی خاص اخلاقی نزاکت اور تواضع کا مظہر تھا، اور اسی سے ان کی علمی و اخلاقی فضا کی ایک خوبصورت جھلک سامنے آتی تھی۔ درس کا ماحول مکمل طور پر علمی تھا اور اس کا محور بھی خالص علمی مباحث تھے۔ طلبہ کا رویّہ یہ تھا کہ انہیں یہاں سے حقیقی علمی استفادہ حاصل کرنا چاہیے، خصوصاً اس لیے کہ حضرت استاد فرمایا کرتے تھے: "اگر کسی کو یہ محسوس ہو کہ اسے اس درس سے کوئی علمی فائدہ نہیں ہو رہا، تو وہ خود ذمہ دار ہے؛ اسے اس درس میں نہیں آنا چاہیے، میں اس کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔" حوزہ علمیہ کا عمومی ماحول بھی ایسا ہی ہے کہ اگر کوئی طالب علم کسی درس سے مطلوبہ علمی استفادہ نہ کر سکے تو وہ اس درس میں شرکت جاری نہیں رکھتا۔

حضرت استاد کا شہید رہبر سے تعلق اور مختلف جہات میں رہبرِ معظم سے ان کی مشابہت، اگرچہ انقلابی طلبہ کے لیے ایک قلبی کشش کا باعث بنتی تھی، لیکن یہ چیزیں دیرپا بنیاد نہیں تھیں؛ کیونکہ اصل مسئلہ یہی نہ تھا۔ سب لوگ ان کے درس میں اس کے علمی امتیاز کی وجہ سے شریک ہوتے تھے۔ جب ان کی اصول، حدیث، رجال اور تاریخ پر غیر معمولی دسترس سامنے آتی تو یہی چیز طلبہ کے لیے سب سے زیادہ دل کش ہوتی۔ یہاں تک کہ ہم خود بعض دوستوں کو

دعوت دیتے اور کہتے: "چند نشستوں میں شرکت کیجیے، پھر خود دیکھیں گے کہ یہاں کیا ہوتا ہے!" ہمیں اس بات پر مکمل یقین تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ جس شخص کو اپنی علمی جستجو میں کسی گم شدہ حقیقت کی تلاش ہو، وہ اسے اس درس میں پا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے دوست، جنہوں نے برسوں عرفان اور اخلاق کے میدان میں کام کیا تھا، کتابیں لکھی تھیں اور بڑی محنت کی تھی، ان سے بھی ہم کہتے تھے کہ یہ درس آپ ہی کے لیے موزوں ہے۔ یہی وہ فقہی درس ہے جس کی آپ تلاش کر رہے ہیں۔ عرفان بھی اسی فقہ سے جنم لیتا ہے، بلکہ اس کے اصول سے بھی، چہ جائیکہ خود فقہ سے، جو اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات پر استوار ہے۔

میں خود اس مقام تک پہنچ چکا تھا کہ اپنے آپ سے کہتا تھا: شاید اگر میں کسی دوسرے شہر چلا جاؤں تو زیادہ بہتر خدمت انجام دے سکوں؛ خواہ حوزہ علمیہ میں صرف و نحو کی تدریس کے ذریعے، یا مسجد میں دینی اور ثقافتی سرگرمیوں کے ذریعے۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اب قم میں میرا قیام میرے لیے زیادہ سود مند نہیں رہا۔ یہ نہیں کہ قم کے علمی ماحول میں کوئی کمی تھی، بلکہ میں خود مزید کچھ حاصل نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی دوران مجھے شہید مطہریؒ کا ایک واقعہ یاد آیا کہ انہوں نے فرمایا تھا: "قم میں مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میں علمی لحاظ سے ختم ہوتا جا رہا ہوں، یہاں تک کہ میری ملاقات علامہ طباطبائیؒ سے ہوئی، اور اس ملاقات نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔" بالکل یہی کیفیت میری بھی تھی۔ علمی اعتبار سے میں تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ اگرچہ خود بھی مدرس تھا اور کفایہ پڑھاتا تھا، لیکن مجھے محسوس ہوتا تھا کہ گویا موجودہ علمی فضا وہ نہیں جس کی مجھے تلاش ہے، اور نہ ہی یہ ہمیں اس فقاہت کے قریب لے جاتی ہے جسے اہلِ بیت علیہم السلام نے فقیہ کے وسیع تر مفہوم میں بیان فرمایا ہے۔ جب میں نے حضرت استاد کے درس میں شرکت کی تو مجھے احساس ہوا کہ علم کی دنیا کو ایک بالکل نئے انداز سے بھی جیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً یہ کہ وہ درسِ اصول کے اختتام اور درسِ فقہ کے آغاز کے درمیان تقریباً دس سے پندرہ منٹ قرآنِ کریم کی تفسیر بیان فرمایا کرتے تھے۔ اس طرح اصول، قرآن اور فقہ ایک ہی علمی سلسلے میں یکجا ہو جاتے تھے۔

ان تفسیری مباحث میں حضرت استاد عرفانی، توحیدی، کلامی اور اجتماعی موضوعات پر گفتگو فرماتے تھے، اور آیاتِ قرآنی کی مناسبت سے مختلف موضوعات پر گراں قدر نکات ہمارے سامنے آتے تھے۔ یہ ان سوالات کے علاوہ تھا جو کبھی درسِ اصول یا فقہ کے دوران اٹھتے، اور جن کے جوابات سے دیگر علوم پر ان کی غیر معمولی مہارت بھی نمایاں ہو جاتی تھی۔

میرے لیے اس درس کی ایک اور بڑی کشش یہ تھی کہ واضح محسوس ہوتا تھا کہ دعائیں حضرت استاد کے فکری منابع میں سے ایک اہم منبع ہیں۔ حتیٰ کہ جب ہم کسی لفظ یا اصطلاح کے بارے میں سوال کرتے تو اس کی توضیح دعاؤں کے اقتباسات سے فرماتے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں دعاؤں، توسلات اور مناجات کے ساتھ کس قدر گہرا انس ہے اور وہ کس درجہ اہلِ تضرع و بندگی ہیں۔ انہیں کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی کہ: "اے طلبہ! میرے جیسے بن جاؤ۔" ان کا طرزِ عمل ہی ہمارے لیے ایک عملی درس تھا۔ ان کا ادب مثالی تھا۔ ہمیشہ دو زانو بیٹھتے اور کبھی کسی طالب علم کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ اگر ہم دورانِ گفتگو ان کی بات کے درمیان کچھ عرض کر دیتے تو نہایت ادب سے جواب دیتے اور اپنی بات کا آغاز اس طرح فرماتے: "آپ نے جو نکتہ بیان فرمایا، اس کے بارے میں میری گزارش یہ ہے..." حتیٰ کہ اگر ہماری بات سو فیصد غلط بھی ہوتی، تب بھی ان کے رویے میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آتی تھی۔ یہ ایک دو دن کی بات نہیں، بلکہ آٹھ نو برس کی ہمراہی میں میں نے ان کے اس مؤدبانہ طرزِ عمل میں کبھی کوئی فرق نہیں دیکھا۔

حضرت استاد کے ادب کے حوالے سے مجھے ایک واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے اپنے اعتراض پر بہت زیادہ اصرار کیا اور حضرت آیت اللہ تبریزیؒ کی رائے کا حوالہ دیا۔ اسی وقت حضرت استاد نے فرمایا: "بحث کے دوران میرے اساتذہ کا نام نہ لیا کریں۔" بس اتنا ہی فرمایا۔ جونہی ان کے استاد کا نام لیا گیا، انہوں نے مزید نقد و نظر کو وہیں روک دیا اور صرف اتنی تنبیہ فرمائی کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات میرے لیے بہت قابلِ توجہ تھی۔

اسی طرح ہر تعلیمی سال کے آغاز اور اختتام پر بھی حضرت استاد کچھ نصیحت آمیز کلمات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ کبھی سال کے آغاز میں فرماتے: "ہم تعلیمی سال کے آغاز اور اختتام پر آپ سب سے استحلال کرتے ہیں۔" ان کی مراد یہ ہوتی تھی کہ سال کے آغاز میں وہ طلبہ سے باقاعدہ حاضری اور سنجیدگی کی توقع رکھتے ہیں، اور سال کے اختتام پر ان سے اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔

آخری نشست، جس میں انہوں نے درس دینا روک دیا تھا، صرف ایک حدیث کے بیان تک محدود رہا۔ اگرچہ درسِ خارج کی فقہ یا فتویٰ کی بحث نہیں چل رہی تھی، حضرت استاد نے فرمایا: "میں نے وہاں کہا تھا کہ یہ غسلِ مستحب صحیح ہے یا صحیح نہیں، کیونکہ اس کی دلیل فلاں روایت ہے، جو یا تو ضعیف ہے یا صحیح۔" پھر فوراً فرمایا: "اس نکتے کی بھی بہتر توجیہ کی جا سکتی ہے۔" یعنی انہیں اس بات کی پوری فکر تھی کہ کوئی بات کسی طالب علم کے ذہن میں غلط صورت میں باقی نہ رہ جائے۔

خط: آپ کے نزدیک حضرت استاد کے درس کا علمی ماحول کیسا تھا؟

کبھی حضرت استاد فرمایا کرتے: "میں تاریخ میں پروان چڑھا ہوں۔" کبھی یہ فرماتے: "اس تاریخی نکتے کے بارے میں میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ یہ کس تاریخی کتاب اور اس کے کس صفحے میں مذکور ہے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ تاریخ کے تیس برس کے مطالعے کا حاصل ہے۔" تاریخی مباحث پر ان کی گرفت نہایت مضبوط تھی، اور خصوصاً شیعہ تاریخ اور علمِ حدیث میں ان کی یہ مہارت نمایاں طور پر دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات کسی رائے کی علمی بنیادیں بظاہر مضبوط اور قابلِ دفاع ہوتی تھیں، لیکن میری تعبیر کے مطابق جب حضرت استاد تاریخ کی راہداریوں اور گوشوں میں داخل ہو کر اصحاب اور ائمہؑ کے باہمی تعلقات اور تاریخی پس منظر کو واضح کرتے تھے، تو معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ رائے درست نہیں ہو سکتی۔

> وہ توجہ، جو محض درس اور متن سے آگے بڑھ کر تھی، ہمارے لیے نہایت دلکش اور اثر انگیز تھی۔ مثلاً کبھی حضرت استاد، حضرت آیت اللہ بہجت کا کوئی ارشاد نقل فرمایا کرتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں حضرت آیت اللہ بہجتؒ کے ساتھ کتنی گہری آمد و رفت اور قربت حاصل رہی ہے۔ تاہم خود ہی فوراً یہ وضاحت بھی فرما دیتے تھے: "ایسا نہ سمجھیں کہ ہمارا ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق تھا۔" یہ ان کی خاص طرزِ فکر اور تواضع کا مظہر تھا، اور انہی چیزوں سے ان کی بلند اخلاقی شخصیت نمایاں ہوتی تھی۔
>
> ہم بعض ایسے دوستوں سے، جنہوں نے برسوں عرفان اور اخلاق کے میدان میں تحقیق و مطالعہ کیا تھا، کہا کرتے تھے: "یہی وہ درسِ فقہ ہے جس کی آپ تلاش میں تھے؛ عرفان اسی فقہ سے پھوٹتا ہے۔"

حضرت استاد ہمیشہ مسائل کو ان کے تاریخی سیاق و سباق میں بیان کرتے تھے۔ میں خود علمِ رجال میں مہارانہ کام کر چکا تھا، لیکن یہ نئے روابط اور تاریخی پیوند میرے لیے نہایت دل چسپ تھے۔

حضرت استاد کبھی اصولی مباحث کو بچوں کے جوڑنے والے کھلونوں سے تشبیہ دیتے تھے؛ یعنی انسان ایک ایک پرزہ جوڑتا جاتا

ہے اور ایک عمارت یا ڈھانچا تیار کر لیتا ہے۔ پھر فرماتے تھے کہ کبھی ضروری ہوتا ہے اس تعمیر کو کچھ فاصلے سے دیکھا جائے، تاکہ اس کی کجیاں اور خامیاں نمایاں ہو سکیں۔ مبادیات اور نتائج کی جانچ اور ان کی علمی آزمائش کے حوالے سے حضرت استاد کا یہ کلامی زاویۂ نگاہ نہایت اہم اور قابلِ توجہ تھا۔

خط: یعنی وہ علمِ کلام کے زاویۂ نظر سے نتائج کا بھی جائزہ لیتے تھے؟

جی ہاں۔ یعنی ان کے نزدیک صرف ظاہری استدلالات اور قیاسی قواعد پر اکتفا کرنا کافی نہیں تھا، بلکہ ضروری تھا کہ حاصل ہونے والے نتائج کو بیرونی زاویے سے بھی پرکھا جائے اور ان کی صحت کی تحقیق کی جائے۔ یہ طرزِ فکر، خصوصاً تاریخی متون اور اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات کے مطالعے میں، نہایت دل چسپ اور ثمر آور ثابت ہوتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ رائج حوزوی مباحث — مثلاً صرف اس پر اکتفا کرنا کہ شیخ طوسیؒ یا دیگر فقہا نے کیا فرمایا ہے — کے بجائے حضرت استاد کسی حدیث کے مضمون کو شیعہ تاریخ کے تناظر میں تلاش کرتے تھے، اور بسا اوقات یہی تاریخی تحقیق نتیجے کو یکسر بدل دیتی تھی۔

> **کبھی حضرت استاد فرمایا کرتے: "اس تاریخی نکتے کے بارے میں میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ یہ کس تاریخی کتاب اور اس کے کس صفحے میں مذکور ہے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ تاریخ کے تیس برس کے مطالعے کا حاصل ہے۔"**

خط: آپ نے فرمایا کہ حضرت استاد اصول اور فقہ کے باہمی ربط کے قائل تھے۔ کیا اس کی کوئی عملی مثال بیان کر سکتے ہیں؟

جی ہاں۔ حضرت استاد کا نظریہ یہ تھا کہ علمِ اصول کو فقہ کے بطن سے طلوع ہونا چاہیے۔ وہ علمِ اصول کو ایک وسیع قرآنی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے اور اسے عبد اور مولا کے باہمی تعلق کی تحقیق قرار دیتے تھے۔ ان کی بنیادی بحث یہ تھی کہ ہمارے سامنے دو طرح کے مولا ہوتے ہیں:

۱. مولائے الٰہی: جس کے رأس پر اللہ تعالیٰ ہیں، پھر انبیائے کرام اور ائمۂ اطہار علیہم السلام۔

۲. مولائے عرفی: جیسے باپ، جس کی روز مرہ معاملات میں اطاعت اولاد پر لازم ہوتی ہے۔

حضرت استاد کے نزدیک علمِ اصول ان دونوں دائروں میں کارآمد ہے۔ مولائے عرفی کے بارے میں، مثلاً یہ کہ باپ اگر اپنے بیٹے کو پانی لانے کا حکم دے تو کیا اس حکم میں فوریت پائی جاتی ہے یا کچھ تاخیر کی گنجائش بھی ہے؟ اس قسم کے قواعد علمِ اصول میں زیرِ بحث آتے ہیں۔

لیکن حضرت استاد جس بنیادی نکتے پر زور دیتے تھے، وہ یہ تھا کہ علمِ اصول کو صرف مولائے عرفی اور اس کے احکام تک محدود نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ ہمارے دینی معارف کا ایک بڑا حصہ — جیسے نماز — مولائے الٰہی سے متعلق ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولائے الٰہی اور مولائے عرفی کے درمیان یہی بنیادی فرق علمِ اصول کو دو مختلف جہات میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ فرق علمِ اصول کی متعدد مباحث، خصوصاً حجت اور لاحجت جیسے موضوعات میں نمایاں ہو جاتا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ کسی مسئلے، مثلاً برات کی بحث میں، ہم کہتے کہ عقلا کا طریقہ یہی ہے؛ لیکن حضرت استاد قرآنِ کریم کی آیات یا فقہی مثالوں کی روشنی میں واضح کرتے کہ مولائے الٰہی کے بارے میں اس اصول کو اسی صورت میں نافذ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ مولائے الٰہی کا طرزِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مولائے عرفی کے نزدیک کوئی معاملہ بہت اہم ہو، اور شک پیدا ہو جائے، تو وہ احتیاط کا حکم دیتا ہے۔ جیسے ایک باپ اپنے اس بیٹے سے، جسے یقین نہ ہو

کہ اس نے گھر کا دروازہ بند کیا ہے یا نہیں، کہتا ہے: "جاؤ، دوبارہ جا کر دیکھو۔ "لیکن ہماری شریعت میں، جس کے اہم ترین احکام میں سے ایک نماز ہے، مولائے الٰہی ایسے شخص سے، جسے نماز ختم کرنے اور سلام کہنے کے بعد قرات یا کسی دوسرے جز کے بارے میں شک ہو جائے،—برخلاف تمام عرفی موالی کے، جو احتیاط کا حکم دیتے ہیں—فرماتا ہے کہ: "اپنے شک کی پروانہ کرو، اور قاعدۂ فراغ جاری کرو۔"

مولائے الٰہی کی سیرت کو بھی ہم قرآنِ کریم، فقہ کے مسلمات اور اہلِ بیت علیہم السلام کی روایات سے دریافت کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک مولائے الٰہی کی تعریف انہی بنیادی مصادر کی روشنی میں ہونی چاہیے۔ پھر اسی تعریف کی بنیاد پر علمِ اصول کے قواعد اور حجتوں کی بنیاد رکھی جائے۔ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں علمِ اصول خود بخود قرآنی اور روائی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔[1] وہ مولائے الٰہی، جو فرماتا ہے: "میں نے تمہارے لیے جنت پیدا کی ہے اور چاہتا ہوں کہ تم رشد و کمال حاصل کرو۔"

ہم نے حضرت استاد کے درس میں اسی مولائے الٰہی کو پہچانا، اور یہ سمجھا کہ جس خدا کو ہم فقہ میں دیکھتے ہیں، اسی خدا کو علمِ اصول میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ہمارے دوست کہا کرتے تھے: "آدمی جب کچھ عرصہ حاج آقا کے درسِ فقہ میں شرکت کرتا ہے تو اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب وہ پہلے سے بہتر نماز پڑھ رہا ہے۔" یعنی مولائے الٰہی کی طرف یہ توجہ رفتہ رفتہ انسان کی عبادت گزاری اور روحِ تعبد پر اثرانداز ہونے لگتی تھی۔

(۱) ہم عموماً علمِ اصول کو فقہ کا ایک آلہ اور وسیلہ سمجھتے ہیں، لیکن حضرت استاد نے یہ دکھایا کہ کس طرح خود فقہ بھی علمِ اصول کی بنیاد بن سکتی ہے۔ (علی آبادی)

بعض اوقات حضرت استاد کسی اصولی بحث کا آغاز قرآنی یا کلامی زاویۂ نظر سے کرتے، پھر اس کے نتائج کو علمِ اصول کے مباحث میں دنبال کرتے تھے۔ یعنی ان کے پاس علمِ اصول سے باہر کچھ ایسے بنیادی قواعد موجود تھے جنہیں وہ اصولی مباحث میں جاری و ساری کرتے تھے۔ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ علومِ اسلامی کی مختلف کڑیاں—یعنی قرآن، علمِ کلام، علمِ اصول اور دیگر علوم—آپس میں ایک مربوط زنجیر کی صورت اختیار کر رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ حضرت استاد اس حقیقت پر زور دیتے تھے کہ جس خدا کا تعارف ہمیں قرآن میں ملتا ہے، علمِ اصول میں بھی گفتگو اسی خدا کے بارے میں ہوتی ہے، اور فقہ میں بھی وہی خدا حاضر ہے۔ یہ الگ الگ علوم کے الگ الگ خدا نہیں، بلکہ ہر جگہ وہی ایک خدا ہے، جس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔

بعض اوقات ہمارے دوست کہا کرتے تھے: "آدمی جب کچھ عرصہ حاج آقا کے درسِ فقہ میں شرکت کرتا ہے تو اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب وہ پہلے سے بہتر نماز پڑھ رہا ہے۔"

خط: اس طرزِ فکر کو فطری طور پر اچھے علمی ابداعات اور تخلیقی نتائج تک پہنچنا چاہیے؟

یہ نکتہ میرے لیے بہت زیادہ دل چسپی کا باعث تھا۔ استاد علمی مسائل میں جدتِ فکر رکھتے تھے۔ وہ مسائل کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے اور غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کس قدر عمیق غور و فکر کرتے ہیں۔

ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ کسی مسئلے میں پانچ آراء بیان کی جائیں، پھر کہا جائے کہ دو دلیلوں کی بنا پر یہ رائے درست نہیں۔ اس کے بعد کوئی استاد کہے کہ میں تین دلیلوں سے اس کے بطلان کو ثابت کرتا ہوں۔ یقیناً یہ بھی علمی قوت کی علامت ہے۔ لیکن ایک دوسری صورت یہ ہے کہ استاد فرمائیں: "ان پانچوں آراء کی بنیاد ہی ابتدا سے غلط ہے، اور اس مسئلے کا ایک بالکل مختلف راستہ موجود

ہے۔" پھر وہ اس نئے راستے کے لیے دلائل، شواہد، روایات اور دینی معارف سے مضبوط استدلال فراہم کریں۔ یہ یقیناً پہلی صورت سے کہیں بلند تر اور زیادہ گہرا علمی مقام ہے۔ میرے خیال میں جن عوامل نے بعض مسائل میں استاد کو اس نئی بصیرت تک پہنچایا، ان میں ایک اہم سبب مولائے الٰہی کے بارے میں ان کا مخصوص زاویۂ نظر تھا۔

البتہ ایسا بھی نہیں تھا کہ استاد حوزۂ علمیہ میں رائج علمی آرا اور تنقیدات سے بے اعتنائی برتتے ہوں۔ بسا اوقات وہ ایک ہی مسئلے میں دس مختلف نظریات پیش کرتے، ان پر ہونے والے «قُلْتُ» اور «اِنْ قُلْتُ» کی بحثیں بیان کرتے، نیز یہ بھی واضح کرتے کہ مثلاً مرحوم میرزا نائینی نے فلاں مقام پر کس شخصیت کے نظریے کو سامنے رکھ کر گفتگو کی، اور ان کے بعد کس نے اس کا جواب دیا۔ استاد کا نظریہ یہ تھا کہ فقہ میں ہمارا تعلق مولائے الٰہی سے بھی ہے اور مولائے عرفی سے بھی۔ اس لیے ہمیشہ اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ ممکن ہے کسی مسئلے میں مولائے الٰہی کا طریقۂ کار مولائے عرفی سے مختلف ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں کا طریقہ ایک ہی ہو۔

وہ بارہا تاکید فرماتے تھے کہ ہر فقیہ کے ذہن میں اصول کا ایک مکمل فکری نظام موجود ہوتا ہے، جس کی بنیاد پر وہ قواعد کو ترتیب دیتا اور فقہی استنباط انجام دیتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ علمِ اصول کے رائج مباحث میں، مثلاً «حکمِ ظاہری اور حکمِ واقعی کے اجتماع» یا «واجبِ مشروط» جیسے موضوعات، اگرچہ بظاہر زیادہ عملی ثمرات نہیں رکھتے، لیکن درحقیقت یہی وہ بنیادی میدان ہیں جہاں مختلف اصولیوں کے فکری نظام ایک دوسرے کے مقابل نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر ان مباحث کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو، مثال کے طور پر، مرحوم نائینی کے تقریباً اسی فیصد اصولی نظامِ فکر کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی انہی مباحث کے ذریعے کسی اصولی کی پوری فکری ساخت اور بنیادی ڈھانچے کو دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے استاد ان مباحث کو ہرگز سرسری انداز میں نہیں گزارتے تھے۔

ایک اور اہم پہلو، جس پر استاد مسائل کی تدریس میں خصوصی توجہ دیتے تھے، شاگرد سازی تھا۔ مثال کے طور پر، «شراب کی طہارت و نجاست» کی بحث کے آغاز میں انہوں نے فرمایا: "یہ مسئلہ نہ تو عام لوگوں کی عملی ضرورت سے متعلق ہے اور نہ ہی ایسا مسئلہ ہے جس میں قابلِ ذکر اختلاف پایا جاتا ہو۔ شراب یا پاک ہے یا نجس؛ اور قرآنِ کریم نیز مسلمانوں کے اجماع سے اس کے پینے کی حرمت ثابت ہے، لہٰذا اس پہلو سے کوئی بحث نہیں۔" لیکن اس کے بعد فرمایا: "البتہ یہ بحث تمہارے لیے ایک اہم علمی فائدہ رکھتی ہے، کیونکہ اس باب میں باہم متعارض روایات کی بڑی تعداد موجود ہے، اور آپ ان روایات کے درمیان تطبیق اور جمع کی مشق کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے یہ بحث نہایت اہم ہے۔"

خط: تفسیر کے درس کے بارے میں بھی کچھ عرض فرمائیے۔

تفسیر کے درس میں بھی استادِ محترم عموماً قرآنِ کریم کی مختصر سورتوں، مثلاً سورۂ حجرات، کا انتخاب فرماتے اور ان کی تشریح و توضیح پیش کرتے تھے۔ بعض اوقات آیات کے ترجمے، الفاظ کے معانی یا معروف تفاسیر کی روشنی میں بھی گفتگو فرماتے۔ ہمارے ایک دوست، جنہوں نے تفسیر المیزان اور تفسیر نمونہ سمیت متعدد تفاسیر کا مطالعہ کیا تھا، ان کا کہنا تھا کہ سورۂ حجرات کے بارے میں استاد کی پیش کردہ تفسیر ان تمام تفاسیر کے مجموعے سے کسی لحاظ سے کم نہیں تھی۔ تاہم، استاد کبھی یہ تاثر نہیں دیتے تھے کہ وہ کوئی غیر معمولی یا نہایت اہم بات بیان کر رہے ہیں۔ درحقیقت، یہ ان کی عمومی خصوصیت تھی کہ وہ نہایت عمیق اور اثر انگیز نکات کو اس قدر سادگی سے بیان کرتے کہ اگر سامع پوری توجہ نہ دیتا تو ان کی گہرائی اور اہمیت کو محسوس ہی نہ کر پاتا۔

ان دروس کی ایک اور نمایاں خصوصیت، جو خود قرآنِ کریم کی روش سے ماخوذ تھی، ان کا تنوع تھا۔ آیات کے موضوعات کے مطابق، جن میں بعض جنت سے متعلق ہوتیں، بعض جہنم سے، اور بہت سی دیگر مختلف موضوعات پر مشتمل ہوتیں، استاد اخلاقی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی مباحث بھی بیان فرماتے۔ اس طرح ہمیں ان تمام میدانوں میں ان سے رہنمائی حاصل کرنے کا موقع ملتا تھا۔

قرآنِ کریم کے ساتھ استاد کا طرزِ تعامل بھی نہایت قابلِ توجہ تھا۔ درس کے دوران جب وہ کسی آیت کی تشریح کرتے تو ایسا محسوس ہوتا جیسے قرآن ایک زندہ حقیقت کی صورت میں وہاں موجود ہو، اور گفتگو اسی کی بارگاہ میں ہو رہی ہو۔ گویا یہ ایک ایسی عظیم ہستی ہے جس کے بارے میں کوئی بات انتہائی احتیاط کے بغیر نہیں کہی جا سکتی۔ اسی وجہ سے وہ تفسیر میں بہت احتیاط سے کام لیتے اور اکثر "شاید" جیسے الفاظ استعمال کرتے، تاکہ اپنی رائے کو قطعی فیصلہ بنا کر پیش نہ کریں۔ ان کے اس انداز سے سامع کے دل میں یہ احساس مضبوط ہوتا تھا کہ قرآن واقعی کلامِ الٰہی ہے۔

ایک مرتبہ درس کے بعد میں نے ان سے اس آیتِ کریمہ کے بارے میں سوال کیا: ﴿قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَهَبْ لِي مُلْكًا لَا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي﴾ میرے ذہن میں یہ اعتراض تھا کہ حضرت سلیمانؑ نے اللہ تعالیٰ سے ایسی بادشاہت کیوں طلب کی جو ان کے بعد کسی اور کے لیے مناسب نہ ہو؟ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ بہتر دعا یہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ وہ حکومت حضرت سلیمانؑ کو بھی عطا فرماتا اور بعد کے مؤمنین اور انبیا کو بھی۔ دعا میں یہ انحصار میرے لیے باعثِ حیرت تھا۔ درس کے بعد جب میں نے یہ سوال پیش کیا تو استاد نے فرمایا: "میری رائے یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں انبیا علیہم السلام کی زبان سے منقول تمام دعائیں، اللہ تعالیٰ کی تلقین کردہ دعائیں ہیں۔" یعنی اس دعا میں جو انفرادیت پائی جاتی ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے حضرت سلیمانؑ کی زبان پر جاری کی گئی، تاکہ اسی صورت میں قبول ہو۔ میرے لیے یہ بات نہایت دلچسپ تھی، کیونکہ اس سے اندازہ ہوا کہ استاد نے انبیائے کرامؑ کی قرآنی دعاؤں پر پہلے ہی گہرے غور و فکر کیا تھا؛ ورنہ یہ ایسا جواب نہیں تھا جو محض سوال سننے کے بعد فوراً ذہن میں آجاتا۔

ان مباحث کے ساتھ ساتھ، استاد مناسب مواقع پر اخلاقی نصیحتیں اور اہلِ بیت علیہم السلام سے توسل کے حوالے سے بھی قیمتی ہدایات دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر، وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ انسان کو تمام اہلِ بیت علیہم السلام کے ساتھ قلبی انس اور معنوی تعلق قائم کرنا چاہیے اور کسی بھی معصومؑ سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ چنانچہ وہ کبھی یہ بھی تجویز فرماتے کہ نماز کے بعد کی بعض عبادات کا ثواب امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کی خدمت میں ہدیہ کیا جائے، تاکہ ان سے روحانی تعلق مضبوط ہو۔ قرآنی مباحث کے دوران اس نوعیت کی نصیحتیں نہایت قیمتی اور دل نشین محسوس ہوتی تھیں۔

خط: کیا درس کے دوران روزمرہ کے حالات یا سیاسی موضوعات پر بھی گفتگو ہوتی تھی؟

استاد کے دروس کی علمی فضا کی ایک نہایت نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ روزمرہ کے سیاسی یا حالاتِ حاضرہ سے متعلق مباحث میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص ایک سال تک ان کے درس میں شریک رہے، تو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ استاد رہبرِ انقلاب کے فرزند ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ان کی پوری توجہ صرف احادیث کے مطالعے، فقہی اور اصولی مبانی پر تحقیق اور علمی مباحث پر مرکوز ہے۔ البتہ، جو افراد درس کے علاوہ دیگر مواقع پر ان سے رابطے میں رہتے تھے، ان کے مشاہدات یقیناً

مختلف ہوتے تھے، لیکن درس گاہ کے ماحول میں سیاسی فضا کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سماجی موضوعات میں بھی وہ زیادہ تر ایسے امور کا ذکر کرتے تھے جیسے جہادی تعمیراتی کیمپوں میں خدمت انجام دینا یا قدرتی آفات، مثلاً سیلاب، کے متاثرین کی امداد کرنا۔ اس ضمن میں وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ خدمت کا جذبہ وقتی یا موسمی نہ ہو، بلکہ مستقل اور پائیدار ہونا چاہیے۔

انتخابات کے موقع پر بھی ان کی گفتگو صرف ایک عمومی نصیحت تک محدود رہتی تھی کہ لوگوں کو انتخابات میں شرکت کی ترغیب دی جائے۔ اس سے آگے وہ کسی خاص سیاسی موقف یا انتخابی بحث میں داخل نہیں ہوتے تھے۔

خط: استاد کی وہ نمایاں خصوصیات جو آپ نے درس کے دوران مشاہدہ کیں، ان کے بارے میں بھی کچھ فرمائیے۔

استاد کی ایک نمایاں خصوصیت ائمۂ معصومین علیہم السلام کے ساتھ ان کا غیر معمولی ادب و احترام تھا۔ مثال کے طور پر، جب بھی وہ کسی روایت کی قرات کرتے اور اس میں کسی معصوم امام علیہ السلام کا اسمِ مبارک آتا، تو ہر مرتبہ باقاعدگی سے «صلواتُ اللہِ وسلامُہ علیہ» جیسے احترام آمیز الفاظ ادا کرتے تھے۔ بعض اوقات ایک ہی روایت میں امام علیہ السلام کا نام یا ان کی طرف لوٹنے والی ضمیر کئی مرتبہ آتی، اور استاد ہر بار اسی ادب و تعظیم کے ساتھ یہ عبارت دہراتے تھے۔ ائمۂ اطہار علیہم السلام کی بارگاہ میں یہ دقت، تعبد اور احترام نہ صرف ان کی گفتگو میں بلکہ ان کے پیغامات اور تحریروں میں بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتا تھا۔

اسی طرح، وہ مستحق اور غریب افراد کی خدمت کو بھی غیر معمولی اہمیت دیتے تھے، اور اس مقصد کے لیے انہوں نے کئی رفاہی ادارے قائم کیے تھے۔ اس سلسلے میں قابلِ توجہ بات یہ تھی کہ وہ امدادی سرگرمیوں کے تسلسل پر خاص زور دیتے تھے۔ مثال کے طور پر، ایک دوست جو فلاحی کاموں میں مصروف تھے، بیان کرتے تھے کہ استاد نے فرمایا: "اس بات کا خیال رکھیں کہ اگر آپ اس سال نوروز کے موقع پر کسی غریب کی مدد کرتے ہیں، تو آئندہ سال اسے نظر انداز نہ کریں؛ کیونکہ اب وہ آپ کی مدد کا منتظر ہوگا اور امید رکھے گا کہ اگلے سال بھی آپ اس کی دستگیری کریں گے۔"

خط: اگر درس کے حوالے سے کوئی یادگار واقعہ بھی ہو تو بیان فرمائیے۔

مجھے جو باتیں خاص طور پر یاد رہ گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک وقت میرے ذہن میں آیا تھا کہ کسی دوسرے شہر جا کر رہوں اور وہاں تدریس بھی کروں، لیکن ساتھ ہی قم کے علمی ماحول سے دور ہونے کی فکر بھی لاحق تھی۔ اس سلسلے میں میرے ایک دوست نے استاد سے میری طرف سے مشورہ طلب کیا۔ استاد نے جواب میں فرمایا: "تدریس، آپ کی تعلیم ہی کا ایک حصہ ہے اور یہ آپ کے علمی سفر کے مراحل میں سے ایک مرحلہ شمار ہوتی ہے۔" یہ مختصر مگر گہرا جملہ میرے لیے نہایت رہنمائی کرنے والا اور قلبی اطمینان کا باعث بنا۔

استاد کے درس میں علمی مباحث کے ساتھ ساتھ خوشگوار لمحات بھی ہوتے تھے، جس کی وجہ سے درس کا ماحول کبھی خشک یا یکسان محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کلاس کی فضا اس قدر دوستانہ اور اخلاص سے بھرپور تھی کہ علمی استفادے کے ساتھ ایک قلبی وابستگی بھی پیدا ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب کچھ عرصے کے لیے درس تعطیل ہو جاتا تو ہم سب دوست اس کی کمی شدت سے محسوس کرتے اور ان نشستوں کی یاد ستاتی تھی۔

بعض اوقات کچھ طلبہ اپنے نومولود بچوں کو اس غرض سے استاد کی خدمت میں لاتے کہ وہ ان کے کان میں اذان کہیں، یا اپنی ذاتی زندگی کے مسائل میں ان سے مشورہ حاصل کرتے۔ استاد ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی، محبت اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کا استقبال کرتے، ان کی درخواستیں قبول فرماتے اور ان کے لیے پورا وقت نکالتے تھے۔ یہی حسنِ اخلاق، تواضع اور لوگوں کے لیے وقت نکالنے کی عادت ان کی شخصیت کی نمایاں خصوصیات میں سے تھی۔

خط: اگر کوئی تکمیلی نکتہ ہو تو ارشاد فرمائیے۔

حضرت استاد کے فکری مبانی نہایت دقیق اور باریک ہیں۔ اگر

> **اگر کوئی شخص ایک سال تک ان کے درس میں شرکت کرے، تو اس کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آئے گا کہ استاد، رہبرِ انقلاب کے فرزند ہیں۔**

انہیں پوری توجہ کے ساتھ نہ سنا جائے یا ان کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے، تو غلط فہمی اور کج فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ کسی شخصیت کے فکری اور علمی مبانی کا عمیق ادراک، دقیق نظر اور باریک بینی کے ساتھ مطالعہ و تحقیق کا متقاضی ہوتا ہے، تاکہ سطحی اور ناقص فہم سے بچا جا سکے۔

صبّار و شکور افراد کے لیے اللہ تعالیٰ کا خاص رزق
استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ﴾ (لقمان:۳۱)

"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کشتیاں سمندر میں اللہ کی نعمتوں (پانی، سمندر، ہوا اور باد) کے ذریعے چلتی ہیں (اور اس کی نعمتوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں) تاکہ وہ تمہیں اپنی بعض نشانیوں (توحید، قدرت اور حکمت) میں سے دکھائے؟! بے شک اس (امر) میں ہر صبر کرنے والے، شکر گزار شخص کے لیے نشانیاں ہیں۔"

جن آیات میں "آیات" اور "آیت" کا ذکر آیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص "صبّار" اور "شکور" ہو تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک خاص رزق اسے عطا ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں تمام آیات توحیدی ہیں؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو توحید سے خالی ہو۔ یہ توحیدی نکات، یہ خاص رزق اور یہ معرفتیں، اسی شخص کو نصیب ہوتی ہیں جو "صبّار" اور "شکور" ہو؛ یعنی جس کے اندر صبر اور شکر کی صفت انتہائی کمال اور مبالغے کی حد تک موجود ہو۔

ایسا شخص جب اللہ تعالیٰ کی نشانیوں پر غور کرتا ہے تو اس کی معرفت میں غیر معمولی ترقی ہوتی ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ ہم سورج کو دیکھیں اور زیادہ سے زیادہ علمی اعتبار سے ہماری توحیدی معرفت میں اضافہ ہو جائے، لیکن صبّار و شکور شخص کی کیفیت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر، بلکہ صرف در و دیوار، چاند، سورج اور دیگر مخلوقات کو دیکھ کر بھی توحید کے ایسے حقائق کو سمجھ لیتا ہے جنہیں دوسرے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔

۲/ جنوری ۲۰۱۸

منفرد عید: عیدِ غدیر



ایک شاگرد کا واقعہ

یادیں

ایک سال عیدِ غدیر بدھ کے دن آئی۔ عید سے ایک روز پہلے، یعنی منگل کو، حسبِ معمول ہم حاج آقا کے درس میں شریک ہوئے۔ درس ختم ہوا تو طلبہ آہستہ آہستہ رخصت ہوگئے۔ میں وہیں ٹھہر گیا اور موقع ملا کہ ایک علمی سوال ان سے دریافت کروں۔ دل میں خیال آیا کہ چونکہ کل میں تہران میں نہیں ہوں گا اور حاج آقا سے ملاقات بھی نہیں ہوگی، اس لیے آج ہی ان سے عیدی لے لوں؛ ایسی عیدی جو محبت و عقیدت کا اظہار ہو، نہ کہ بے تکلفی یا جسارت کا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کمرے میں کوئی اور موجود نہیں، تو مسکراتے ہوئے عرض کیا: "حاج آقا! عیدی نہیں دیں گے؟" وہ تبسم فرمانے لگے اور فرمایا: "میرے پاس پیسے نہیں ہیں!" ان کی زبان سے یہ جملہ سننا میرے لیے حیرت کی بات نہ تھی، کیونکہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ واقعی ان کی جیب میں کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

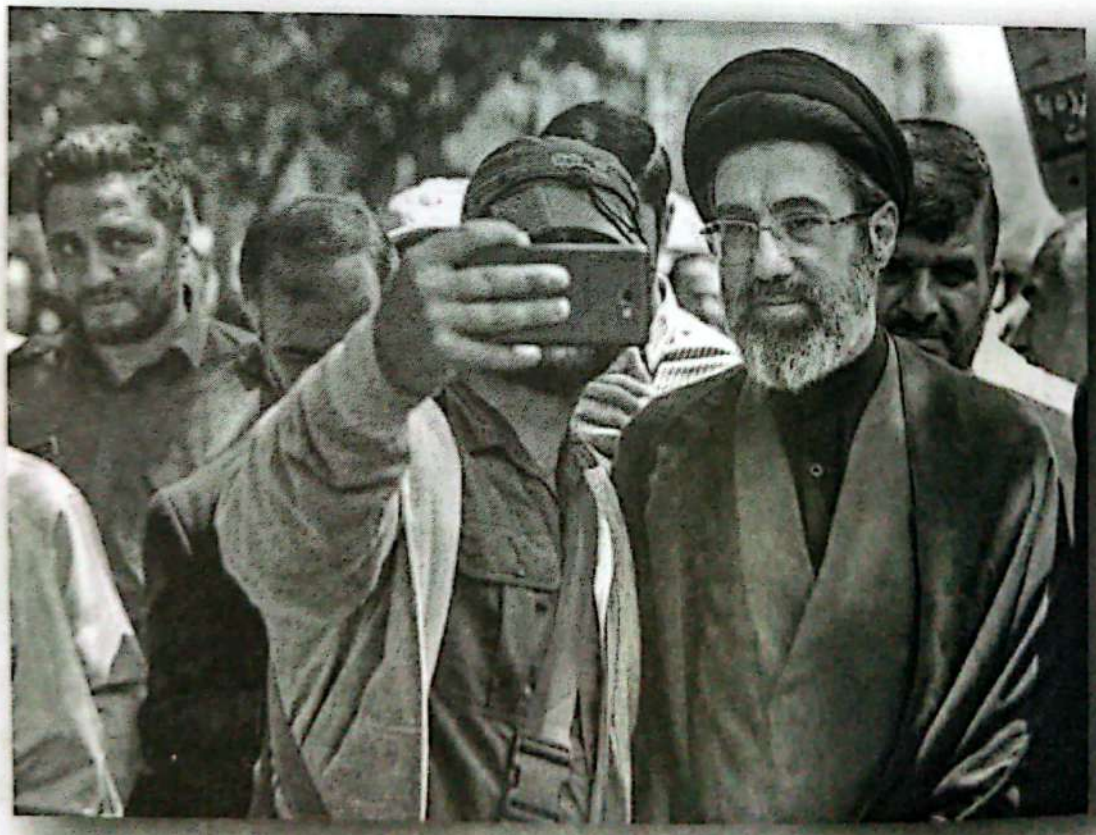
ایک مرتبہ دفتر میں ایک خاتون مدد کی درخواست لے کر آئی تھیں۔ وہ حاج آقا کو پہچانتی نہیں تھیں اور انہیں دفتر کا کوئی عام کارکن سمجھ بیٹھی تھیں۔ انہوں نے کہا: "حاج آقا! کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟" حاج آقا نے نہایت سادگی اور خلوص سے فرمایا: "بہن! خدا کی قسم، میری جیب میں کچھ بھی نہیں ہے۔" وہاں موجود ایک دوست نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جیب سے دس ہزار تومان نکال کر کہا: "حاج آقا! اس بے چاری کو مایوس نہ کیجیے۔" حاج آقا نے رقم لے لی اور اس دوست سے فرمایا: "پھر یہ قرض رہے گا، بعد میں آپ کو واپس کر دوں گا۔" دوست نے بار بار عرض کیا: "نہیں حاج آقا! یہ قرض نہیں، بلکہ ہدیہ ہے۔" لیکن انہوں نے یہ بات قبول نہ کی، اور آخر تک وہ دس ہزار تومان اپنے ذمے قرض ہی سمجھتے رہے؛ حالانکہ ان کی اپنی جیب میں اتنی رقم بھی موجود نہ تھی۔

ان کی یہی شخصیت تھی کہ جب میں نے عیدی مانگی تو اپنی ہمیشہ کی سادگی اور صداقت کے ساتھ فرمایا: "میرے پاس پیسے نہیں ہیں، لیکن میں تمہیں ایک حدیث عیدی کے طور پر دیتا ہوں۔" یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ مجھے ایک حدیث عیدی کے طور پر ملی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا تھا کہ کوئی اس طرح بھی تحفہ دے سکتا ہے۔ میں یہ حدیث پہلے پڑھ چکا تھا، لیکن کبھی اس زاویے سے نہیں دیکھا تھا؛ یعنی ایک تحفے اور تبرک کے طور پر۔ بعد میں جب دوبارہ اس کی طرف رجوع کیا، تب اس کی قدر و منزلت کو بہتر طور پر سمجھ سکا۔ یہ روایت الکافی، جلد ۴، صفحہ ۳۱۴ میں نقل ہوئی ہے۔

موسیٰ بن قاسم روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام محمد تقی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا: "میں کبھی عمرہ یا حج کے لیے جاتا ہوں اور کبھی آپ کی طرف سے، اور کبھی آپ کے والد گرامی امام رضا علیہ السلام کی طرف سے عمرہ انجام دیتا ہوں۔ کیا اس میں کوئی مسئلہ ہے؟" امام علیہ السلام نے فرمایا: "نہیں، اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔" تین سال بعد موسیٰ بن قاسم دوبارہ حج پر گئے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا: "جب امام اور ان کے والد گرامی کی طرف سے نیابت جائز ہے، تو کیوں نہ ان کی والدہ اور ان کے پاکیزہ آباؤ اجداد کی طرف سے بھی عمرہ انجام دوں؟" چنانچہ انہوں نے رسولِ خدا ﷺ،

امیر المؤمنین علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، امام سجاد علیہ السلام، امام باقر علیہ السلام، امام صادق علیہ السلام اور امام کاظم علیہ السلام کی طرف سے بھی عمرہ ادا کیا۔ واپسی پر جب امام جواد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اپنے اعمال کی گذارش پیش کی۔ امام علیہ السلام نے دریافت فرمایا: "کیا میری والدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی طرف سے بھی عمرہ انجام دیا؟" عرض کیا: "کبھی کبھی۔" امام علیہ السلام نے فرمایا: «اِستَکثِر مِن هٰذا، فَاِنَّهُ اَفضَلُ مَا اَنتَ عامِلُهُ اِن شاءَ اللهُ.» یعنی: "اس عمل کو زیادہ انجام دیا کرو، کیونکہ ہماری والدہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی خدمت میں ثوابِ اعمال کا ہدیہ پیش کرنا، تمہارے تمام اعمال میں سب سے زیادہ فضیلت والا عمل ہے، ان شاء اللہ۔"

حاج آقا نے یہی روایت مجھے عیدی کے طور پر عطا کی۔ اس سال میری عیدِ غدیر، امام کی نگاہِ کرم سے، فاطمی رنگ میں رنگ گئی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا سے یہ خصوصی محبت خود حاج آقا اور ان کے والدِ بزرگوار کی شخصیت میں بھی نمایاں تھی؛ ایسی محبت جو ان کے کردار اور طرزِ عمل سے جھلکتی تھی۔ بلاشبہ اس روایت نے ان کی روح پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ باپ اور بیٹا، دونوں اپنی زندگی کی برکت، رزق اور مشکلات کے حل کو حضرت صدیقۂ طاہرہ سلام اللہ علیہا کے دامنِ کرم سے وابستہ سمجھتے تھے، اور امام جواد علیہ السلام کا یہ ارشاد گویا اسی راستے کی ایک روشن تائید تھا۔ روایت مختصر تھی، مگر دل میں اتر جانے والی تھی؛ ایسا تحفہ جس پر نہ کبھی گرد جمتی ہے، نہ وہ کبھی ختم ہوتا ہے، بلکہ ہر مرتبہ اسے پڑھنے سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عیدی وصول کرنے کا وہی لمحہ ایک بار پھر زندہ ہو گیا ہو۔





حجۃ الاسلام مجید قاسمی کی یادداشتیں

(نگران استاد/سوپروایزر)

یادداشت

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے بارے میں، جوان کے تحقیقی کام کے نگران استاد تھے۔

"ان کے کمرے میں یہ نشست تھی، اس لیے ہم مجبوری کے تحت حضرت آقا کی خصوصی ملاقاتوں کے لیے مخصوص کمرے میں چلے گئے۔ چونکہ اس کمرے میں صرف ایک ہی کرسی تھی، یعنی وہی کرسی جو حضرت آقا استعمال کرتے ہیں، اس لیے ہم دونوں زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح ادب وانکساری کے ساتھ دوزانو زمین پر بیٹھ گئے، حتیٰ کہ دیوار سے بھی ٹیک نہیں لگائی، حالانکہ عام طور پر رواج یہی ہے کہ استاد کرسی پر بیٹھتا ہے۔"

نگران استاد: آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای

دو سو تین سو طلبہ پر مشتمل ایک درسی حلقے میں ہر شخص کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے تحقیقی کام کے لیے استاد کو بطور راہنما منتخب کر سکے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو یہ موقع مل جائے تو وہ اپنے استاد کے ساتھ علمی اور تحقیقی تعلق کے ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے جس سے دوسرے شاگرد محروم رہتے ہیں۔ حجۃ الاسلام مجید قاسمی ایک نوجوان عالمِ دین ہیں، جنہیں یہ توفیق حاصل ہوئی کہ وہ اپنے سطحِ چہارم[1] کی تحقیق، "خارجہ پالیسی میں رہبرِ معظم انقلاب کی سلامتی سے متعلق حکمتِ عملیوں کے قرآنی و حدیثی مبادیات"، کو آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی نگرانی میں تحریر کریں، اور فروری ۲۰۱۸ء میں اس کا کامیابی سے دفاع کریں۔

واقعہ یوں تھا کہ حجۃ الاسلام قاسمی نے کچھ عرصہ استاد کے درس میں شرکت کے بعد ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے سطحِ چہارم کی تحقیق کے نگران بن جائیں۔ آقا مجتبیٰ نے پہلے استخارہ کیا، اور جب استخارے کا نتیجہ اچھا آیا تو اس ذمہ داری کو قبول فرمایا۔ مجید قاسمی

(۱) دینی حوزہ علمی میں سطح چار، یونیورسٹی تعلیم کی ڈاکٹریٹ کے مساوی ہے اور اس کے اختتام پر تحقیقی کام یا تھیسس لکھنا ہوتا ہے۔

بیان کرتے ہیں: "میری تحقیق کا ابتدائی موضوع 'خارجہ پالیسی میں رہبرِ معظم انقلاب کی سلامتی سے متعلق حکمتِ عملیوں' پر تھا۔ میں نے یہ موضوع استاد کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا: 'موضوع اچھا ہے، لیکن آؤ اسے دینی طالب علمی کا رنگ دیتے ہیں۔' چنانچہ موضوع تبدیل ہوکر 'خارجہ پالیسی میں رہبرِ معظم انقلاب کی سلامتی سے متعلق حکمتِ عملیوں کے قرآنی و حدیثی مبادیات' بن گیا۔" وہ مزید کہتے ہیں: "استاد دو طرح کی بصیرت رکھتے تھے؛ ایک عمومی اور دوسری جزئی۔ میں نے خود دیکھا کہ وہ میری تحقیق کی رہنمائی بھی انہی دو بنیادوں پر کرتے تھے۔ عمومی سطح پر ان کی رائے یہ تھی کہ جس طرح ایک ملک پانچ بنیادی ستونوں ــــ سیاسی، اقتصادی، عسکری، سلامتی اور ثقافتی ــــ پر قائم ہوتا ہے، اسی طرح میری تحقیق کو بھی، اپنے موضوع کی مناسبت سے، انہی پانچ بنیادی محوروں پر مرتب ہونا چاہیے۔ اسی بنا پر میں نے انہی پانچ جہات میں تحقیق کا آغاز کیا۔ پہلے متعلقہ حکمتِ عملیوں کو استخراج کیا، پھر ان کے قرآنی و حدیثی مبادیات کا جائزہ لیا، اور یہ پورا تحقیقی عمل تقریباً دو سال پر محیط رہا۔"

ایک منٹ کی بھی تاخیر کے بغیر

حجۃ الاسلام قاسمی کے پاس ان دو برسوں کی بہت سی یادیں ہیں، جن میں سے بعض انہوں نے ہمارے ساتھ بیان کی ہیں۔ جناب سید مجتبیٰ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

"استاد عموماً اپنی ملاقاتوں کا آغاز صبح پانچ بجے، یعنی نمازِ فجر کے بعد، کرتے تھے اور یہ سلسلہ رات تک جاری رہتا تھا۔ ایک مرتبہ میری ان سے تہران میں ان کے دفتر میں صبح پونے سات بجے ملاقات طے تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس دن میں ان سے ملاقات کرنے والا پہلا شخص ہوں گا، لیکن معلوم ہوا کہ مجھ سے پہلے حاج آقا طائب (سپاہ کے سابقہ انٹیلیجنس سربراہ) ان سے ملاقات کر چکے تھے۔"

عام طور پر مصروف شخصیات کے ساتھ ملاقاتوں میں کچھ تاخیر ہونا ایک معمول کی بات سمجھی جاتی ہے، لیکن آقا مجتبیٰ کی تمام ملاقاتیں مقررہ وقت پر ہی شروع ہوتی تھیں۔ حجۃ الاسلام قاسمی کہتے ہیں:

"تقریباً دو سال تک، جب میں اپنی تحقیق کی رہنمائی کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، ان کی بے شمار علمی اور عملی مصروفیات کے باوجود، میں نے کبھی انہیں ایک منٹ کی بھی تاخیر سے آتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مقررہ وقت پر جلسے میں موجود ہوتے تھے۔"

"میری کوئی حیثیت ہی نہیں"

حجۃ الاسلام قاسمی جناب مجتبیٰ کے احترام آمیز اور نہایت متواضعانہ طرزِ عمل کے بارے میں بھی چند یادیں بیان کرتے ہیں:

"جب ملاقات کے لیے آنے والے افراد انتظار گاہ میں بیٹھے ہوتے، تو استاد خود انہیں لینے تشریف لاتے اور ان کے ساتھ چل کر کمرۂ ملاقات میں داخل ہوتے۔ ملاقات کے دوران بھی وہ میز کے پیچھے نہیں بیٹھتے تھے، تاکہ ماحول میں افسر اور ماتحت کا احساس پیدا نہ ہو۔ ملاقات کے اختتام پر بھی مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے جاتے تھے۔"

- "اگرچہ میں ان کا ایک معمولی شاگرد تھا، لیکن کمرے میں داخل ہوتے اور باہر جاتے وقت وہ مجھ سے نہایت محبت اور احترام سے پیش آتے تھے۔"
- "درسِ خارج کے تمام برسوں اور تحقیق کی خصوصی نشستوں کے دوران، میں نے کبھی انہیں غصے کی حالت میں نہیں دیکھا۔ خاص طور پر جب بعض طلبہ غیر متعلقہ اعتراضات اٹھاتے یا درس کے بعد غیر منطقی مطالبات کرتے، تب بھی وہ ہمیشہ انتہائی وقار اور تحمل کے ساتھ پیش آتے تھے۔"
- "حالانکہ وہ حوزہ اور جامعہ دونوں کے ممتاز اور مسلم استاد تھے، لیکن تحقیق کی تیاری کے دوران کئی مرتبہ مجھ جیسے ایک معمولی

طالبِ علم سے فرماتے: 'آؤ، اس مسئلے پر مل کر مباحثہ کرتے ہیں۔' حالانکہ عام طور پر مباحثہ ہم مرتبہ افراد کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کا یہ انداز ان کی گہری عاجزی اور انکساری کا واضح ثبوت تھا۔"

• "دفاع سے پہلے ایک استاد نے میری تحقیق پر چند نامناسب اعتراضات کیے۔ میں نے استاد سے عرض کیا: 'اگر خدانہ کرے اس سے آپ کی شان پر کوئی حرف آتا ہو، تو ہم دفاع کو کسی اور وقت تک مؤخر کر دیتے ہیں۔' انہوں نے نہایت عاجزی سے فرمایا: 'میری کوئی حیثیت ہی نہیں۔' پھر وہ خود دفاعی نشست میں شریک ہوئے اور تحقیق کے حق میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا: 'اگر یہ تحقیق میں جانچتا تو اسے ۱۹٫۵ نمبر دیتا۔'"

• "ایک مرتبہ طے ہوا کہ ہم اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوں تاکہ وہ ہمارے نومولود بچے کے کان میں اذان اور اقامت پڑھیں۔ انہی دنوں انہیں ایک اہم کام پیش آگیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ مقررہ وقت پر تشریف لائے اور نہایت سکون، وقار اور اطمینان کے ساتھ اذان و اقامت پڑھی۔ اس کے بعد انہوں نے ہمارے دوسرے بچے سے بھی محبت بھرے انداز میں گفتگو کی اور اس پر شفقت فرمائی۔"

ذاتی خرچ پر

مجید قاسمی کے نزدیک جناب سید مجتبیٰ کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک بیت المال کے بارے میں ان کی غیر معمولی حساسیت اور اس کے ساتھ ان کی سادہ اور بے تکلف زندگی تھی۔

حجۃ الاسلام قاسمی اس بارے میں کہتے ہیں: "دن بھر مختلف مہمان اور مراجعین ان سے ملاقات کے لیے آتے تھے۔ ان کی تواضع صرف چائے سے کی جاتی تھی، اور خود استاد بھی اسی پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کا کمرہ صرف ایک سادہ فرش سے آراستہ تھا، اور ذاتی طور پر بھی ان کا لباس نہایت سادہ، مگر صاف ستھرا اور مرتب ہوتا تھا۔"

بیت المال کے بارے میں ان کی حساسیت کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں: "میں انتظار گاہ میں بیٹھا تھا کہ مستخدم نے میرے لیے بتی روشن کر دی۔ جب میں حضرت استاد کے ساتھ ملاقات کے کمرے کی طرف گیا تو استاد واپس پلٹے اور انتظار گاہ کی بتی خود بند کی۔"

وہ مزید کہتے ہیں: "درسِ خارج کی نشستوں میں مہمانوں کی تواضع کے لیے استعمال ہونے والا سامان، حتیٰ کہ درس کی ریکارڈنگ کے لیے استعمال ہونے والا کیمرہ بھی، سب کچھ ان کے ذاتی خرچ سے خریدا گیا تھا۔ میری تحقیق کے دفاع کی ویڈیو بھی اسی کیمرے سے ریکارڈ کی گئی تھی۔"

حق الناس کے بارے میں ان کی حساسیت کا ذکر کرتے ہوئے مجید قاسمی بیان کرتے ہیں: "ایک نشست میں، میرے اور آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے علاوہ، حجۃ الاسلام حاج آقا صادقی (سپاہ میں ولی فقیہ کے نمائندے) بھی بطور مشیرِ تحقیق موجود تھے۔ نشست کے اختتام پر حاج آقا صادقی نے فرمایا کہ انہیں آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای سے چند منٹ کے لیے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ حضرت استاد نے فوراً فرمایا: 'یہ وقت جناب قاسمی کا ہے، اگر وہ اجازت دیں تو کوئی حرج نہیں۔' میں نے عرض کیا: 'حضرت استاد! ہمارا اختیار بھی آپ ہی کے ہاتھ میں ہے۔'"

جہان شناس

مجید قاسمی کی تحقیق کا موضوع، رہبرِ معظم انقلاب کی خارجہ پالیسی کی حکمتِ عملیوں سے متعلق تھا۔ اسی مناسبت سے انہیں عالمی سیاسی اور تزویراتی موضوعات پر جناب سید مجتبیٰ کے خیالات کو قریب سے سننے کا موقع ملا، جن کی بعض یادیں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں: مجید قاسمی کہتے ہیں: "کئی بار بیرونِ ملک سیاسی تحریکوں یا عالمی سیاسی حالات کا

ذکر ہوا تو استاد نے نہایت دقیق انداز میں ان تحریکوں کا تعارف کرایا، یہاں تک کہ ان کے رہنماؤں کے ذاتی نام بھی جانتے تھے۔"

وہ ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں: "میرے مقالے کا ایک حصہ امریکی ڈرون کو ایران کی جانب سے شکار کیے جانے کے واقعے سے متعلق تھا، جس میں ایران کو برتری حاصل ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بارے میں استاد نے فرمایا: 'اس قضیے میں اوباما نے ہر ممکن کوشش کی، صرف روئے نہیں!'"

"آقا (رہبر) کی عقلِ منفصل"

"عقلِ منفصلِ آقا" ایک ایسا لقب تھا جو جناب سید مجتبیٰ کے ایک قریبی دوست نے ان کے لیے استعمال کیا تھا۔ مجید قاسمی بھی اس حوالے سے ایک یادگار واقعہ بیان کرتے ہیں: "ایک نشست میں، تحقیق کے ایک موضوع کی مناسبت سے میں نے لفظ 'تہدید' (خطرہ) استعمال کیا۔ استاد نے اس پر نہایت مفصل گفتگو فرمائی۔ انہوں نے خطرے کی مختلف اقسام، خطرہ پیدا کرنے والے عوامل اور خطرے کا سامنا کرنے والے فریقوں کی تشریح کی۔ پھر فرمایا کہ ایک موقع پر حضرت آقا نے خود ان سے اس موضوع پر تحقیق کرنے کے لیے کہا تھا۔"

برکتوں کا نزول، اجتماعی تقویٰ سے مشروط
استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾
(الاعراف:۹۶)

"اور اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انہوں نے (ہماری آیات کو) جھٹلایا، تو ہم نے انہیں ان کے اعمال کی سزا میں گرفتار کر لیا۔"

یہ آیت اس حقیقت کے بارے میں ہے کہ ہماری بعض محرومیاں اور نعمتوں کا سلب ہونا ہمارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان اور تقویٰ موجود ہو تو اللہ کی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔

لیکن اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ بعض اوقات کوئی اثر، جیسے دشمن پر فتح و کامیابی، فرد کے تقویٰ سے نہیں بلکہ اجتماعی تقویٰ سے مشروط ہوتی ہے۔ ممکن ہے کسی جماعت میں ایک شخص ایسا ہو جو سب سے زیادہ متقی ہو، لیکن وہ پوری جماعت مجموعی طور پر تقویٰ والی جماعت نہ ہو۔

۲۴ر فروری ۲۰۱۸ء

واقعات کے قلب میں تیس سالہ موجودگی

دکتر مہدی مشکی



انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی شخصیت میں قائدانہ خصوصیات
ڈاکٹر مہدی مشکی (رکنِ ہیئتِ علمی، مؤسسۂ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ) سے گفتگو

خط: آپ کی جناب سید مجتبیٰ سے آشنائی کب سے ہے؟

میں پہلے حاج آقا مصطفی سے آشنا ہوا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں، جب میں مدرسۂ حاج آقا مجتہدی میں داخل ہوا، تو فطری طور پر ایک علمی مباحثے کے حلقے میں شامل ہو گیا، جس میں وہ بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ میری حاج آقا مصطفی سے قربت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ انہیں معلوم ہوا کہ ہمارے ماموں آقایان پہلوانی سعادت پرور ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ ان کا تعلق اور توجہ مزید مضبوط ہو گئی۔

حاج آقا مجتبیٰ، حاج آقا مصطفی، بلکہ مجموعی طور پر رہبرِ انقلاب کے تمام فرزند، جیسے ہی جان لیتے کہ کوئی شخص روحانیت اور عرفان کا ذوق رکھتا ہے، اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان حضرات کے تعلقات آیت اللہ کشمیری، آیت اللہ صدیقین (اصفہان) اور آیت اللہ بہاء الدینی جیسے بزرگوں سے تھے، بالکل اسی طرح جیسے خود حضرت آقا کے تھے۔

۱۹۸۷ء میں حاج آقا مجتبیٰ مدرسۂ حاج آقا مجتہدی میں آئے۔ اس زمانے میں صبح کے وقت میری ان سے صرف سلام دعا کی حد تک ملاقات ہوتی تھی۔ قم آنے کے پہلے سال ہم نے کتاب «مکاسبِ محرمہ» ایک ساتھ مباحثہ کی۔ اگلے سال، یعنی ۱۹۸۸ء میں، ہم نے آیت اللہ استادی سے درخواست کی کہ وہ آکر ہمیں کتابِ بیع کا درس دیں۔ ایک سال بعد، درسِ مکاسب میں ہم سب اکٹھے ہوتے تھے۔ میں، حاج آقا مصطفی، آیت اللہ شبستری کے فرزند، شہید مفتح کے فرزند، آقای رفیق دوست کے فرزند، اور حاج آقا مجتبیٰ، سب اس درس میں شریک ہوتے تھے۔ درسِ مکاسب کے دوران میری ان کے ساتھ مسلسل نشست رہی۔ وہ نہایت ذہین، مضبوط فکر رکھنے والے اور غیر معمولی فہم و ادراک کے حامل تھے، البتہ کلاس میں زیادہ سوالات اٹھانے کے عادی نہیں تھے۔

اگرچہ حاج آقا مجتبیٰ، حاج آقا مصطفی کے دو یا تین سال بعد حوزۂ علمیہ میں داخل ہوئے تھے، لیکن علمی دروس میں ان کا علمی معیار تقریباً ہمارے برابر تھا۔ نقل کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی تعلیمی زندگی کی نہایت دقیق منصوبہ بندی کرتے تھے؛ یعنی ہر سال کون سا درس پڑھنا ہے، اس کا فیصلہ اور انتظام وہ خود کرتے تھے۔

بعد کے زمانے میں بھی میرا ان کے دفتر آنا جانا رہا۔ وہاں وہ مختلف علمی اور مشاورتی نشستیں منعقد کرتے تھے۔ وہ صنعتی امور اور اسی نوعیت کے دیگر شعبوں سے متعلق سرگرمیوں میں بھی فعال کردار ادا کرتے تھے اور ملک کے مختلف اداروں اور مراکز کے ساتھ ان کے وسیع روابط تھے، جن میں سلامتی (سیکیورٹی) سے متعلق امور بھی شامل تھے۔

ان کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے بغیر کسی تشہیر، شور و غوغا یا نمود و نمائش کے، نہایت خاموشی اور وقار کے ساتھ ایک یا دو اداروں کی ذمہ داری سنبھالی۔ میرے خیال میں

ان کا اپنا دفتر بھی تھا اور دفتر کا ایک مدیر بھی۔ اس کے باوجود، ان کی شخصیت انتہائی متواضع اور اعلیٰ اخلاق کی حامل تھی۔

وہ فقہ واصول کے دروس میں آیت اللہ میرزا جواد تبریزی اور آیت اللہ شبیری زنجانی کے شاگرد رہے۔ میرے خیال میں کچھ عرصہ آیت اللہ وحید خراسانی کے دروس میں بھی شریک ہوئے تھے۔ اگرچہ مجھے ہر درس میں ان کی شرکت کی صحیح مدت معلوم نہیں، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ انہوں نے آیت اللہ تبریزی کا پورا دورۂ اصول مکمل کیا تھا۔ البتہ آپ جانتے ہیں کہ فقہ، اصول کی طرح دورانیہ مقرر نہیں رکھتی اور اس کی تدریس مسلسل جاری رہتی ہے۔ اسی طرح وہ آیت اللہ مؤمن کے دروسِ اصول میں بھی شریک رہے تھے۔

میرے اندازے کے مطابق اب تقریباً پندرہ سے سولہ سال ہو چکے ہیں کہ وہ درسِ خارج کی تدریس میں مشغول ہیں، اور انہوں نے اس میدان میں دوسروں سے پہلے قدم رکھا۔ درسِ خارج کی تدریس کا آغاز غیر معمولی جرأت کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ علمی مباحث میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی مطلب کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اسے عمدہ انداز میں پڑھا بھی لیتا ہے، لیکن اس میں تحلیل کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تجزیہ وتحلیل کی قوت، محض سمجھنے یا نقل کر دینے سے کہیں بلند مقام رکھتی ہے۔ علمی پختگی کا اگلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان گہری فہم، عمدہ بیان اور دقیق تجزیے کے ساتھ ساتھ علمی تنقید کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ بعض افراد صرف اچھے مقرر ہوتے ہیں، لیکن ایک عالم کے لیے اعلیٰ ترین علمی مقام یہ ہے کہ وہ فہم، نقد اور تحلیل سے آگے بڑھ کر نظریہ سازی کے درجے تک پہنچ جائے۔ نظریہ سازی سے مراد یہ ہے کہ وہ یہ کہہ سکے: "اس رائے میں مسئلہ ہے، میں اسے قبول نہیں کرتا"، اور پھر اس کے مقابلے میں اپنا مستقل نظریہ پیش کرے۔ حاج آقا مجتبیٰ اس بلند علمی مقام تک پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ کوئی شخص جوانی ہی میں، تقریباً چالیس برس کی عمر میں، یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ قم کے حوزۂ علمیہ کے قلب میں، اتنی بڑی تعداد میں طلبہ کے سامنے، کھلے عام درسِ خارج دے، جہاں اس کی ہر بات علمی تنقید کے لیے پیش ہو۔

یہ بھی بالکل واضح ہے کہ اگر کسی استاد کے پاس اپنا مستقل نظریہ نہ ہو اور وہ کوئی نئی علمی بات پیش نہ کرتا ہو، تو اس کے درس میں اتنی بڑی تعداد میں طلبہ جمع نہیں ہوتے۔ صرف یہ بات کہ وہ رہبرِ معظم انقلاب کے فرزند ہیں یا کسی خاص سماجی مقام کے حامل ہیں، اس غیر معمولی استقبال کی وجہ نہیں بن سکتی۔ فرض کیجیے کہ کوئی طالبِ علم صرف اپنی پہچان بنانے کے لیے کسی استاد کے درس میں شرکت کرنا چاہتا ہو۔ جب کسی استاد کے آٹھ سو یا نو سو شاگرد ہوں، تو اس بات کا امکان کتنا ہوگا کہ استاد خود اسے دیکھے یا پہچانے؟ اگر درس میں صرف دس افراد ہوتے تو کہا جا سکتا تھا کہ ان میں شریک ہو کر پہچان بنائی جا سکتی ہے، لیکن اتنے بڑے مجمع میں ایسی امید رکھنا حقیقت پسندانہ نہیں۔

کسی علمی شخصیت کے لیے اعلیٰ ترین علمی مرتبہ یہ ہے کہ وہ فہم، تنقید اور تجزیے کے ساتھ ساتھ نظریہ سازی کے مقام تک بھی پہنچ جائے۔ حاج آقا مجتبیٰ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں۔

خط: وہ کس وجہ سے رہبر بنے؟

رہبری کے مسئلے میں، ہماری نظر میں جناب سید مجتبیٰ کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اس معیار پر پورا اترتا ہو۔ جو شخص آج کے نظام میں ولایتِ فقیہ جیسی عظیم ذمہ داری سنبھالنے والا ہو، اس کا جائزہ مختلف معیارات اور درجات کی بنیاد پر لیا جانا چاہیے۔ یہ دیکھا جانا چاہیے کہ فقہ میں ان کا درجہ کیا ہے، نفس کی حفاظت اور تقویٰ میں ان کا مقام کیا ہے، اور انتظام وتدبیر میں ان کی صلاحیت کس درجے کی ہے۔ ان تمام پہلوؤں کی اہمیت یکساں نہیں ہوتی، بلکہ ہر ایک کا

اپنا الگ وزن اور درجہ ہوتا ہے۔ آیت اللہ خامنہ ای (شہید) کے انتخابِ رہبری کے وقت بھی بعض لوگ کہتے تھے کہ آیت اللہ گلپایگانی تیس برس سے مرجعِ تقلید ہیں۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ ولایتِ فقیہ کے لیے کون سا معیار زیادہ اہم ہے؟ فقاہت کا درجہ یا انتظام وقیادت کی صلاحیت؟ یہی اصل اور نہایت اہم نکتہ ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ان سے زیادہ اعلم یا افقہ افراد بھی موجود ہیں۔ مان لیا، لیکن صرف فقہ کا بلند مقام کافی نہیں، بلکہ اصل اہمیت انتظام، تدبیر اور قیادت کی صلاحیت کو حاصل ہے۔ یہاں تک کہ خود فقاہت کے بارے میں بھی، اگر آپ حضرت امام خمینیؒ کا منشورِ روحانیت مطالعہ کریں، تو وہ واضح طور پر فرماتے ہیں کہ آج کے حوزات میں رائج اجتہاد، معاشرے کے نظم ونسق کے لیے کافی نہیں ہے۔ آج کے مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ استعمار کی اقتصادی، سیاسی اور عسکری مکروفریب پر مکمل نظر رکھتا ہو۔ یہ کہ اسے صرف اجتہاد میں مہارت حاصل ہو اور کہے کہ احادیث پر میری گرفت ہے، آج کی پیچیدہ دنیا میں صرف اتنا کافی نہیں ہے۔ اگر ایک مجتہد جدید مسائل اور معاصر حالات کی صحیح شناخت حاصل نہ کرے، تو روایات پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود بھی مصداق کی تشخیص میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ آج کی دنیا میں ہمارے بہت سے فقہی مسائل کی بنیاد ہی صحیح مصداق کی پہچان ہے۔ مثال کے طور پر، کیا اس وقت دشمن کے ساتھ جنگ کا موقع ہے یا صبر اور انتظار کی حکمت اختیار کی جانی چاہیے؟ یا یہ کہ موجودہ عالمی مالیاتی نظام میں قرضی رقوم ربا کے تحقق کا سبب بنتی ہے یا نہیں؟ مرجعیت اور فقاہت کی پوری تاریخ میں ہمارے اہم ترین مسائل میں سے ایک یہی بنیادی مسئلہ رہا ہے کہ صحیح مصداق کی تشخیص کیسے کی جائے۔

دستوری تحریک (مشروطہ) کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ فضل اللہ نوری مسلمانوں پر کفار کے غلبے کے حقیقی مصداق کو بخوبی سمجھتے تھے، جبکہ اُس زمانے کے بعض مراجع اس کی صحیح تشخیص نہ کر سکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دستوری تحریک محض ایک بہانہ اور چال ہے تاکہ پہلے بے دینی کو فروغ دیا جائے اور پھر ایک آمرانہ نظام قائم کیا جائے۔ تمام علما اصولی طور پر اقتدار کو محدود کرنے (دستور) کے حامی تھے، لیکن اصل اختلاف مصداق کی تشخیص میں تھا۔ اسی طرح میرزا شیرازی کے تاریخی فتوے کو دیکھیے۔ ہمارے پاس ایسی کوئی روایت موجود نہیں جو یہ کہتی ہو کہ تمباکو کا استعمال حرام ہے اور امامِ زمانؑ کے خلاف جنگ کے مترادف ہے۔ یہ ایک مرجعِ تقلید کا کمال ہوتا ہے کہ وہ ہر دور میں اپنی دقیق زمانہ شناسی کی بنیاد پر صحیح مصداق کی تشخیص کرے۔ امام خمینیؒ نے فرمایا تھا کہ چونکہ شیخ فضل اللہ نوری کو عام مرجعیت حاصل نہیں تھی، اس لیے مخالفین انہیں نشانہ بنانے اور شہید کرنے میں کامیاب ہو گئے، حالانکہ انہوں نے حقیقتِ حال اور صحیح مصداق کو درست طور پر پہچان لیا تھا۔

میرا پختہ عقیدہ ہے کہ حاج آقا مجتبیٰ عالمی نظامِ استکبار کو مکمل طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ تیس برس سے زیادہ عرصے تک اہم واقعات کے قلب میں موجود رہے ہیں اور اس پورے عرصے میں رہبرِ معظم انقلاب کے ساتھ رہے ہیں۔ میرے نزدیک تشخیصِ مصداق سے زیادہ اہم کوئی مسئلہ نہیں۔ صدرِ اسلام سے لے کر آج تک امت کو جن بڑے مسائل کا سامنا رہا ہے، ان کی بنیاد زیادہ تر مصداق کی تشخیص ہی رہی ہے۔ اہلِ سنت اور کیتھولک مسیحیت کے ساتھ بھی ہمارا بنیادی اختلاف ولایت کے مصداق پر ہے، ورنہ اصلِ ولایت کی ضرورت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ صحیح مصداق کی تشخیص غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان فقہ، اصول، درایہ اور تفسیر جیسے علوم میں کم از کم مطلوبہ علمی صلاحیت رکھتا ہو، اور اس کے ساتھ ساتھ گہری بصیرت اور وسیع فہم بھی رکھتا ہو۔

« العالمُ بزمانِہ » کا مفہوم کیا ہے؟ جن افراد کا ہم نے جائزہ لیا ہے، ان میں کوئی بھی زمانے کے تقاضوں سے اتنا آگاہ نہیں جتنا وہ ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ "زمانہ شناس ہونا"، منصبِ ولایتِ فقیہ کے لیے نہایت بلند درجہ رکھتا ہے، جبکہ دیگر خصوصیات کی اہمیت اس کے مقابلے میں کم ہے۔ امام خمینیؒ کے نقطۂ نظر کے مطابق، حقیقی اعلم مجتہد وہ ہے جو اپنے گردوپیش کی دنیا کو اچھی طرح پہچانتا ہو اور مصادیق کی تشخیص میں غلط اندازے یا غلط محاسبے کا شکار نہ ہو۔

مرجعِ تقلید اور ولایتِ فقیہ کے مقام کے درمیان فرق کو واضح کرنے کے لیے ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مرجعِ تقلید صرف شرعی حکم بیان کرتا ہے، جبکہ اس حکم کے مصداق کا تعین خود مقلد پر چھوڑ دیتا ہے۔ اس کے برعکس، ولیِ فقیہ خود مصداق کا تعین کرتا ہے اور یہ معاملہ افراد کی ذاتی تشخیص پر نہیں چھوڑا جاتا۔ جب ولی یہ حکم دیتا ہے کہ "استکباری طاقتوں کے خلاف جدوجہد واجب ہے"، تو اس جدوجہد کا مصداق بھی وہی خود متعین کرتا ہے۔

سماجی معاملات میں ولایت کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، کیونکہ ولی مصداق کا تعین کرتا ہے اور معاشرے کے افراد اس کی پیروی کے پابند ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض مواقع پر (اگرچہ ممکن ہے بعض حضرات اس بات کو آسانی سے قبول نہ کریں) ولایت انفرادی معاملات میں بھی مصداق کا تعین کرتی ہے۔

اس نظریے کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ، سند کے ساتھ، نقل کرتا ہوں۔ جناب آقای عبودیت، آقای مؤیدی سے نقل کرتے تھے کہ حضرت امامؒ کے ایک محافظ نے بتایا: "میری اہلیہ شدید وسواس کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کا سارا وقت یا وضو کرنے میں گزرتا تھا یا نماز پڑھنے میں، یہاں تک کہ وہ کوئی دوسرا کام انجام دینے کے قابل نہ رہیں۔ ہماری پوری زندگی مفلوج ہو چکی تھی۔ کسی ذریعے سے یہ مسئلہ حضرت امامؒ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ امامؒ نے دریافت فرمایا: 'آپ کی اہلیہ کس کی مقلد ہیں؟' جب بتایا گیا کہ وہ خود امامؒ کی مقلد ہیں، تو آپؒ نے فرمایا: 'انہیں ایک ماہ تک نہ نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور نہ وضو کرنے کی۔ نماز کو واجب بھی میں نے کہا ہے اور اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ شیطان کا مقابلہ کرنا واجب ہے اور اس کے وسوسوں کی پیروی کرنا حرام ہے۔'" یہ واقعہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ولیِ فقیہ یہاں مصداق کا تعین کرتا ہے اور تشخیص دیتا ہے کہ ان مخصوص حالات میں یہ نماز پڑھنا درحقیقت شیطان کی پیروی کا واضح مصداق ہے۔

اگر یہ تصور حوزۂ علمیہ میں صحیح طور پر رائج ہو جائے، تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جو شخص مصداق کے تعین کا ذمہ دار ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مصادیق کا صحیح شناسا اور اپنے زمانے کے حالات سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اسی نوعیت کا اجتہاد، اجتہاد کی بلند ترین صورت ہے، اور امام خمینیؒ کو دیگر علما سے ممتاز کرنے والی بنیادی خصوصیت بھی یہی تھی کہ وہ مصداق کی درست تشخیص کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔

خط: آپ نے ان کی انتظامی خصوصیات میں کیا چیز نمایاں دیکھی؟

ان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ جو بھی ذمہ داری حاج آقا مجتبیٰ کے سپرد کی جاتی، وہ اسے انتہائی سنجیدگی اور استقامت کے ساتھ اس کے آخری نتیجے تک پہنچاتے تھے۔ وہ کبھی کسی کام کو درمیان میں نہیں چھوڑتے تھے اور نہ ہی سستی یا غفلت سے کام لیتے تھے۔ وہ ہر مسئلے میں پوری توجہ کے ساتھ داخل ہوتے اور جب تک اس کے تمام پوشیدہ پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھ نہ لیتے، چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ باریک بینی سے تحقیق کرتے کہ فلاں مسئلہ کس وجہ سے پیش آیا ہے، اور جب تک اس کا مکمل حل نہ نکل آتا، وہ اس کام کو ختم شدہ نہیں سمجھتے تھے۔ رہبرِ انقلاب کے دفتر میں حاج آقا مجتبیٰ نہایت اہم اور حساس ذمہ داریاں انجام دیتے تھے۔ حاج آقا مجتبیٰ کی شخصیت کے

خلاف منظم پروپیگنڈے کا مرکز ۲۰۰۹ء کا فتنہ تھا۔ منتظری صاحب کے جنازے میں بعض افراد کا نعرہ یہ تھا: "مجتبیٰ، مرجاؤ، رہبری نہ دیکھ پاؤ!" (مجتبیٰ بمیری، رھبری رانبینی)۔ یہ نعرے براہِ راست ان کی شخصیت کو نشانہ بنانے کے لیے لگائے جاتے تھے۔ دشمن کسی ایسے سادہ مدرس یا طالبِ علم سے دشمنی نہیں رکھتا جس کا سیاسی یا اعلیٰ قومی امور سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہی حقیقت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ دشمن، ان میں رہبری کی صلاحیت اور حیثیت محسوس کر رہا تھا؛ ورنہ اسے ان سے کوئی سروکار نہ ہوتی۔ رہبری کے ممکنہ جانشینوں میں جن شخصیات کے نام لیے جاتے رہے، ان میں دشمن کی سب سے زیادہ تخریبی مہم انہی کے خلاف رہی ہے۔

ہفتے کے روز صبح پونے دس بجے ہونے والے میزائل حملے میں ان کا گھر براہِ راست نشانہ بنایا گیا۔ وہ مقام جہاں رہبرِ انقلاب کے فرزندان رہائش پذیر تھے، جائے وقوعہ سے تقریباً پانچ سو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

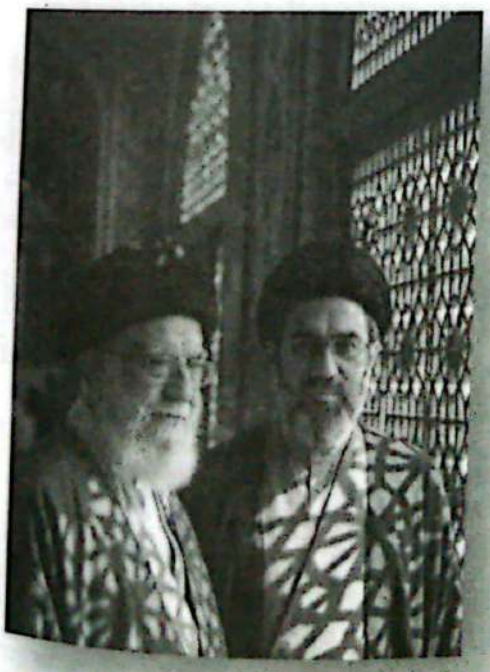
اس وقت حاج آقا مصطفی اور جناب مصباح الہدی باقری (رہبرِ انقلاب کے داماد) عمارت میں موجود تھے۔ اس حملے کے نتیجے میں عمارت کو شدید نقصان پہنچا اور جناب مصباح شہید ہو گئے۔ حاج آقا مجتبیٰ اس وقت گھر کے صحن میں گئے تھے، جبکہ ان کی اہلیہ گھر کے اندر موجود تھیں۔ ان کا محفوظ رہ جانا ایک الٰہی معجزہ محسوس ہوتا ہے۔ وہ صرف چند قدم صحن میں آئے تھے اور سیڑھیوں کی طرف واپس مڑنے ہی والے تھے کہ اسی لمحے دھماکہ ہو گیا۔

حاج آقا مجتبیٰ عالمی نظامِ استکبار کو مکمل طور پر جانتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ تیس برس سے زیادہ عرصے تک اہم واقعات کے قلب میں موجود رہے ہیں۔

خط: کیا آپ نے علماء کی طرف سے ان کی تائید کے بارے میں بھی کچھ سنا ہے؟

مجھے یاد ہے کہ جب رہبرِ معظم انقلاب منصبِ رہبری پر فائز ہوئے تھے، تو میرے ماموں نے فرمایا تھا: "وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤیّد ہیں، اور یہ عظیم ذمہ داری ان ہی کے بس کی ہے۔ اب جو شخص بھی ان کی مخالفت کرے گا، وہ یقیناً جہنم کا راستہ اختیار کرے گا۔" اسی طرح مرحوم حاج اسماعیل دولابی سے یہ بات نقل کی گئی ہے کہ: "جو معنوی مقامات امام خمینیؒ کو عطا کیے گئے تھے، انہوں نے انہیں ایک ہی بار انقلاب کی کامیابی کے لیے انہیں صرف کر دیا تھا، لیکن رہبرِ معظم انقلاب کو یہی مقامات بتدریج عطا کیے جا رہے ہیں۔ ان کا سیر و سلوک در حقیقت انہی عظیم انتظامی ذمہ داریوں اور اعلیٰ سطح کی قیادت میں جلوہ گر ہے۔"

حاج آقا مجتبیٰ کی ولادت سے پہلے، مشہد کے بعض اہلِ معرفت نے رہبرِ معظم انقلاب کو بشارت دی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسا فرزند عطا کرے گا جو بہت حد تک ان ہی سے مشابہ ہو گا۔ یہ بات میں نے ایک بزرگ سے سنی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نقل کرتے تھے: "ہم جب بھی آیت اللہ بہاء الدینی کی خدمت میں حاضر ہوتے، وہ ہمیشہ حاج آقا مجتبیٰ کی دیکھ بھال کا ان کے والد سے کہا کرتے تھے۔



پیامِ امت (۲)

جناب سید مجتبیٰ کے پیغامات پر گروہی سوچ بچار

مہدی قریب



اشارہ: پیشِ نظر متن جناب سید مجتبیٰ کے نوروزی پیغام پر گروہی سوچ بچار کا نتیجہ ہے، جو خانۂ طلابِ جوان کے چند اراکین نے انجام دیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد حوزہ علمیہ کے نوجوان اہلِ فضل ہیں، جو رائج حوزوی تعلیمات اور اعلیٰ سطح کے دروس کی تدریس کے علاوہ، مکتبِ امامینِ انقلاب کے محققین میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ یعنی انہوں نے امام خمینیؒ اور امام شہید کے بہت سے متون کا مطالعہ کیا ہے، ان پر بحث و گفتگو اور فکری تبادلہ کیا ہے، اور ان دونوں عظیم شخصیات کے افکار کے بعض ابواب کو اپنے اجتماعی اور انفرادی تحقیقی موضوعات بھی بنایا ہے۔ نشریہ خط، اس نشست کے نکات پیش کرتے ہوئے، آپ کو بھی جناب سید مجتبیٰ کے متون کے اجتماعی مطالعے کے اس شیریں اور قیمتی تجربے کی دعوت دیتا ہے۔

دوسرا پیغام

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کا نوروز ۱۴۰۵ کے موقع پر پہلا نوروزی پیغام

ایک نہایت اہم نکتہ جو بارہا، بلکہ تقریباً ہر پیغام میں بیان ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ امت کی عبودیت اور سیر و سلوک کے سفر میں اتحاد کو محفوظ رکھا جائے۔ اسی طرح اس حقیقت کو ایک الٰہیاتی نگاہ سے دیکھنا، اسے اللہ تعالیٰ کی نعمت قرار دینا، اور اس نعمت کے استحکام و فروغ کے لیے اللہ کی ناقابلِ تغیر سنتوں سے استفادہ کرنا، نہایت قابلِ توجہ ہے۔

"اس وقت آپ ہم وطنوں کے درمیان، مذہبی، فکری، ثقافتی اور سیاسی پس منظر کے تمام اختلافات کے باوجود جو حیرت انگیز اتحاد پیدا ہوا ہے، اس کے نتیجے میں دشمن میں شکست و ریخت پیدا ہو گئی ہے۔"

"اسے حضرتِ حق جلّ و علا کی جانب سے ایک خاص نعمت سمجھنا چاہیے اور زبان، دل اور عمل کے ذریعے اس پر بہت زیادہ شکر ادا کرنا چاہیے... اس وقت عملی شکر کے طور پر جو چیز ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس عظیم نعمت کو صرف حضرتِ حق جلّ و علا کی طرف سے رحمت

سمجھیں اور حتی الامکان اس سے بہترین فائدہ اٹھائیں۔ اس صورت میں یقیناً یہ اتحاد مزید مضبوط اور سیسہ پلائی دیوار بنے گا اور آپ کے دشمن مزید ذلیل و خوار ہوں گے۔"

حضرت آقا سید مجتبیٰ کی حضرت بقیۃ اللہ الاعظمؑ کی طرف خصوصی توجہ، اس رشد وارتقا کا نتیجہ ہے جو امت نے اضطرار کے حالات میں حاصل کیا ہے۔ یہ اضطرار امام کے ظاہری فقدان کے سبب پیدا ہوا ہے اور اسی نے قابل کی قابلیت کو حضرت بقیۃ اللہ الاعظمؑ کی طرف زیادہ رجوع کرنے کے لیے تیار کیا ہے۔

"امید ہے کہ آپ ملت عزیز کا اس طرح ذمہ دارانہ شب و روز حاضر ہونا اور یوم قدس کے عظیم کارنامے کے بعد، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ اپنے کرم، حلم، عفو اور بے پایاں لطف کے سوا کسی اور انداز سے معاملہ نہ فرمائیں، جن سے ہم اور آپ مانوس ہیں۔ خصوصاً امید ہے کہ وہ جلد ہی ہمارے آقا حضرت ولی اللہ الاعظمؑ کے عمومی ظہور کے معاملے میں عظیم کشادگی کی بشارت عطا فرمائے، تاکہ اس کے ذریعے آنجناب کے مبارک قلب کو سرور حاصل ہو اور اس کے سبب دنیا والوں پر بے شمار برکتیں نازل ہوں گی، بمنّہٖ وکرمہٖ۔"

جزئی اور تفصیلی باتوں پر توجہ دینا، امامت اور قیادت کی خصوصیات میں سے ہے۔ مثال کے طور پر امامِ امت کی شہادت کے بعد نئی شادیوں کی طرف توجہ کرنا۔

"اسی حال میں، میں اپنی حیثیت کے مطابق اور ایک عام شہری کی حیثیت سے، جس کے اردگرد چند شہدا بھی ہیں، یہ تصور کرتا ہوں کہ اگرچہ ہم سوگ کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور ہمارے دل تمام شہدا کے لیے غم واندوہ کا گھر ہیں، لیکن ہمیں اس بات سے بہت خوشی ہوگی کہ ان ایام میں ہماری نئی دلہنیں اور نئے دولہے اپنے گھروں کو آباد کریں، اور ان شاء اللہ ہمارے شہید رہنما اور اس جنگ کے دیگر عظیم شہدا کی دعائیں ان عزیزوں کے اس سفر کے ہمراہ ہوں۔"

معظم رہبر کی جانب سے بارہا دی جانے والی اہم ہدایات میں سے ایک، اتحاد اور وحدت کی حفاظت، دشمن کے کھیل کا حصہ نہ بننا، اور کمزوریوں کو موضوعِ بحث نہ بنانا ہے۔ بدقسمتی سے بعض ایسے افراد، جنہیں بعض خبریں دستیاب ہوتی ہیں یا جن کے پاس ذرائع ابلاغ کا پلیٹ فارم موجود ہوتا ہے، ان ہدایات کی کم ہی رعایت کرتے ہیں۔

"دشمن کا ایک راستہ اس کی ذرائع ابلاغی جنگ ہے، جو ان دنوں خاص طور پر عوام کے ذہن و نفسیات کو نشانہ بنا کر قومی اتحاد، اور اس کے نتیجے میں قومی سلامتی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے... اسی لیے میری اپنے ملک کے تمام داخلی ذرائع ابلاغ سے، خواہ ان کے فکری، سیاسی یا ثقافتی رجحانات میں اختلاف ہی کیوں نہ ہو، یہ سفارش ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ کمزوریوں کو موضوعِ بحث بنانے سے گریز کریں؛ ورنہ دشمن اپنے مقصد تک پہنچ سکتا ہے۔"

ملک کی معاشی حالت اور بنیادی ڈھانچے کی مضبوطی، ہمیشہ سے رہبرانِ جمہوری اسلامی کی نگاہ میں جدوجہد کے میدان میں ایک قسم کی عقلانیت کا مظہر رہی ہے۔ اسی لیے وہ جنگ کو صرف عسکری زاویے سے نہیں دیکھتے، بلکہ اقتصادی جنگ کو بھی ایک حقیقی اور مؤثر حقیقت سمجھتے ہیں۔

"اس ناچیز کی ناقص رائے میں، عوام کی معیشت کا تحفظ، زندگی اور رفاہ کے بنیادی ڈھانچوں کی ترقی، اور تمام لوگوں کے لیے دولت کی پیداوار، ایک مرکزی نکتہ ہے، اور اسے دشمن کی مسلط کردہ اقتصادی جنگ کے مقابلے میں دفاع، بلکہ نمایاں پیش قدمی سمجھنا چاہیے۔"

اقتصادی امور کے ساتھ ساتھ، ہمسایہ ممالک اور عالمِ اسلام کی عمومی فضا کی طرف توجہ یہ سب اس بات کی علامت ہیں کہ کفر و شرک کے مقابلے میں دینی جدوجہد عقلانیت پر مبنی ہے۔ ایسا نہیں کہ صرف عسکری کارروائی یا فوجی طاقت کے ذریعے کفر کے خاتمے کا تصور ہو۔ البتہ یہ توجہ صرف جدوجہد کے عسکری پہلو تک محدود نہیں، بلکہ ایک اثباتی نقطۂ نظر سے عالمِ اسلام کا اتحاد بین الاقوامی سطح پر تمدنِ نوینِ اسلامی کی تشکیل کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

"میں نے اپنے پہلے بیانیے میں ہمسایہ ممالک کے ساتھ تعلقات کے بارے میں نظام کے نقطۂ نظر اور پالیسی کا جو ذکر کیا تھا، وہ ایک سنجیدہ اور حقیقی موقف ہے۔ ہم صرف ہمسائیگی ہی کو بنیاد نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے علاوہ بھی کئی روحانی مشترکات موجود ہیں؛ جن میں سب سے اہم دینِ اسلام پر مشترکہ ایمان ہے۔ اسی طرح بعض ممالک میں باعظمت حرم اور مقدس مقامات کی موجودگی، بعض میں بڑی تعداد میں ایرانی شہریوں کی سکونت اور ملازمت، بعض کے ساتھ مشترکہ نسل، مشترک زبان، یا بعض دیگر کے ساتھ بالخصوص محاذِ استکبار کے مقابلے میں مشترکہ تزویراتی مفادات، یہ سب ایسے عوامل ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔"

نگاہ کی تبدیلی

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿أَفَمَنْ كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ كَمَن زُيِّنَ لَهُ سُوءُ عَمَلِهِ وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ﴾ (محمد: ۱۴)

"کیا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف سے واضح دلیل پر قائم ہو، اس شخص کی مانند ہو سکتا ہے جس کے لیے اس کے برے اعمال خوش نما بنا دیے گئے ہوں اور جو اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتا ہو؟!"

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اوقات کوئی شخص ظلم کرنے پر بھی فخر کرتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ اس کی نگاہ کا بدل جانا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اصل مسئلہ انسان کے توحیدی و الٰہی زاویۂ نظر اور شرک و کفر پر مبنی طرزِ فکر سے متعلق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، جس قدر کسی کا ایمان زیادہ مضبوط ہوتا ہے، اسی قدر وہ حقائقِ عالم کو بہتر انداز میں سمجھتا ہے؛ برائی کو برائی اور بھلائی کو بھلائی ہی سمجھتا اور بیان کرتا ہے۔ لیکن آلودہ دل ایک ایسے آئینے کی مانند ہے جو حقیقت کو کم و بیش اور ٹیڑھے انداز میں دکھاتا ہے۔ نتیجتاً، بعض اوقات انسان ایسی چیز کو، جو حقیقت میں سراسر نقصان ہوتی ہے، اپنے لیے فائدہ مند سمجھنے لگتا ہے۔

۱۰ دسمبر ۲۰۱۶ء

نئے دور کے شیخ بہائی



انجینئر سید امیر حسین کمالی

انٹرویو

رہائشی شعبے کے ایک تمدنی منصوبے میں آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کا ایک علمی تحقیقی بنیاد پر قائم (دانش بنیان) ادارے کے ساتھ تعاون / انجینئر سید امیر حسین کمالی کے ساتھ گفتگو

انجینئر سید امیر حسین کمالی تقویٰ، جامعۂ تہران کے فیکلٹی آف انٹرپرینیور شپ سے MBA (مارکیٹنگ مینجمنٹ) کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہ "اندیشکدہ مطالعاتِ راہبردیِ زیست شہرِ اسلامی" (مرکز فکر تزویراتی مطالعات برائے اسلامی شہری حیات) کے بانی اراکین میں شامل ہیں، نیز "خوزہ کار" کمپنی کے بانی اور چیف ایگزیکٹو آفیسر (CEO) بھی ہیں۔ رہائشی شعبے سے متعلق ایک تمدنی منصوبے میں، جو اندیشکدہ مطالعاتِ راہبردیِ زیست شہرِ اسلامی کے تحت انجام پایا، اُن کا حاج آقا مجتبیٰ کے ساتھ تعاون اور رابطہ، ہمارے لیے اُن سے اس گفتگو کا سبب بنا۔

خط: براہِ کرم اس مرکز کا تعارف بھی کرائیے جہاں آپ سرگرمِ عمل ہیں، نیز یہ بھی بتائیے کہ آپ کی مقامِ معظمِ رہبری سے آشنائی کا ذریعہ کیا بنا؟ آخر میں، میگا مینجمنٹ کے میدان میں اُن کی شخصیت کے بارے میں اپنی مجموعی رائے بھی بیان فرمائیے۔

"اندیشکدہ مطالعاتِ راہبردیِ زیست شہرِ اسلامی" نے جولائی ۲۰۲۰ میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ اس ادارے کے مدیر ڈاکٹر جہانبخش ہیں۔ اُن کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ اسلامی شہری منصوبہ بندی کے موضوع پر تھا، جس میں **فنی اور پیشہ ورانہ مباحث** کے علاوہ آیت اللہ اراکی کے درسِ خارجِ فقہ سے بھی استفادہ کیا گیا تھا۔ ۲۰۱۹ء سے ہمارے کام کا بنیادی خاکہ اور نظریاتی مبادیات تشکیل پا چکے تھے، اور ہم تقریباً ایک جامع نمونے تک پہنچ گئے تھے۔ اسی بنیاد پر ہم نے اپنے منصوبے اُن ذمہ داران کے سامنے پیش کرنا شروع کیے جو ان موضوعات میں دلچسپی رکھتے تھے اور شہری منصوبہ بندی و رہائش کے شعبے میں عملی ذمہ داریاں نبھا رہے تھے۔

ہمارا مقصد یہ تھا کہ اپنے منصوبے پیش کر کے میدانِ عمل کی حقیقت کو زیادہ گہرائی سے سمجھ سکیں۔ ڈاکٹر نیکزاد اور دیگر متعلقہ شخصیات بھی انہی پیشکشوں کے مخاطب تھے۔ اگست/ستمبر ۲۰۲۰ء کے آغاز میں یہ مباحث دفترِ رہبر تک پہنچ گئے۔ وہاں سے ہمیں فون آیا کہ وہ ہماری گفتگو سننا چاہتے ہیں۔ ابتدا میں ہم نے حاج آقا مجتبیٰ کے دفتر کے سربراہ کے سامنے اپنا کام پیش کیا، اور اس کے بعد دفتر کے شعبۂ بازرسی کے ذمہ دار کے سامنے بھی۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ حضرات بعض اہم منصوبوں میں ایک دوسرے کے ساتھ قریبی تعاون رکھتے ہیں۔ انہی نشستوں کے بعد ہمیں حاج آقا مجتبیٰ کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ اُن سے پہلی ملاقات نہایت دلچسپ تھی اور اس میں کئی قابلِ ذکر نکات سامنے آئے۔

خط: اگر ممکن ہو تو اس ملاقات کی تفصیلات بھی بیان فرمائیے۔

حاج آقا مجتبیٰ کے ساتھ ہماری آخری نشست سے پہلے، اس غرض سے کہ ہماری گفتگو مکمل، دقیق اور صحیح انداز میں منتقل ہو اور نشست

اُن کے شایانِ شان ہو، ہم نے پہلے کئی ابتدائی اجلاس منعقد کیے۔ غالباً دو سے تین ہفتے تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ مجھے یاد ہے کہ جب حاج حسین فدائی[1] نے پہلی مرتبہ ہماری پیشکش سنی تو خوشی اور جذبے سے بے اختیار تکبیر بلند کرنے لگے۔ حقیقتاً انہوں نے ہمارے ساتھ نہایت محبت اور حوصلہ افزائی کا برتاؤ کیا۔ اس کے بعد ایک صبح ہمیں حاج آقا مجتبیٰ کی خدمت میں اپنا کام پیش کرنے کا موقع ملا۔

خط: کیا آپ کے ذہن میں یہ تھا کہ آپ کس شخصیت کے سامنے اپنی پیشکش پیش کرنے جا رہے ہیں؟ اور آپ اُس وقت اُن کی ذمہ داری یا منصب کے بارے میں کیا تصور رکھتے تھے؟

ابتدا میں ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ حضرت آقا کے فرزند ہیں اور اُن کے مشیروں میں سے ایک ہیں۔ لیکن ملاقات کے بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ حاج آقا مجتبیٰ اس موضوع پر پہلے ہی سے سنجیدگی کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ کچھ عرصے بعد یہ بھی معلوم ہوا کہ ۲۰۲۰ء میں انہیں تین شعبوں — جدید شہروں، نظامِ صحت اور آبادی — کے حوالے سے رہبرِ معظم کے خصوصی معاون کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کام کے دوران ہمیں یہ حقیقت بھی سمجھ میں آئی کہ مختلف انقلابی حلقوں اور گروہوں کے باہمی تعاون میں بھی وہ ایک مرکزی اور رابطہ ساز کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ نشست تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ ہم نے اپنے نظریاتی مبادیات سے لے کر اس تحقیقی طریقۂ کار تک، جس کے ذریعے ہم ان نتائج تک پہنچے تھے، سب کچھ تفصیل سے بیان کیا۔ جب ہماری پیشکش مکمل ہوئی اور ہم نے اپنے تنقیدی (سلبی) اور تعمیری (ایجابی) نکات پیش کر دیے، تو انہوں نے نہایت انکساری کے ساتھ فرمایا: "ہم بھی کافی عرصے سے مولّد شہروں (Productive Cities) پر کام کر رہے ہیں، لیکن الحمد للہ آپ لوگوں نے اس موضوع میں بہت آگے پیشرفت کی ہے اور اسے جامع و مانع انداز میں دیکھا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے متعدّد دقیق اور جزوی نکات بیان کیے، جن سے اس مسئلے پر اُن کی گہری دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، نظریۂ کفایت محوری کی بنیاد پر انہوں نے فرمایا کہ ایران کے بیشتر علاقوں میں آلو کی کاشت ممکن ہے، لہٰذا وہاں اس کی کاشت ہونی چاہیے۔ اگرچہ شہرِ بہار (ہمدان) اس فصل کے لیے زیادہ موزوں آب و ہوا رکھتا ہے، لیکن ہر صوبے میں اُس علاقے کی آبادی کی ضروریات کے مطابق آلو پیدا ہونا چاہیے، خواہ اس کی لاگت ۲۰ سے ۳۰ فیصد مہنگی ہی کیوں نہ ہو۔

۲۰۰۴ء میں، جب رہبرِ شہید نے فرمایا تھا کہ ہمیں ملک میں ۱۵۰ ملین آبادی کے لیے غذائی تحفظ فراہم کرنا چاہیے، تو حاج آقا مجتبیٰ اس ہدف کے عملی تحقق کے لیے نہایت سنجیدگی سے کوشاں رہے، حالانکہ اُس وقت ملک کے بیشتر ماہرین اور سرکاری حلقے اس تصور کو بعید از امکان سمجھتے تھے۔ وہ نہایت باریک بینی اور گہرے ادراک کے ساتھ مولّد جدید شہروں کے تصور پر گفتگو کرتے تھے۔

خط: یعنی اس سے مراد ایسا شہر ہے جو اپنی تمام ضروریات اپنی ضرورت کے مطابق خود پیدا کرتا ہو؟

جی ہاں، البتہ اُن کا ارضی منصوبہ بندی[2] (Spatial Planning) کا تصور مختلف تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ رہائش کے مسئلے کے حل کے لیے ہمیں عمودی اور گنجان تعمیرات کے بجائے افقی توسیع کی طرف جانا چاہیے اور اس مقصد کے لیے لوگوں کو زمین کے بڑے بڑے قطعات دیے جائیں۔ اس سے مختلف سطحوں پر تمدنی استحکام زیادہ ہوگا۔

---

(۱) دفترِ رہبری کے شعبۂ بازرسی کے ذمہ دار

(۲) اس کا مقصد زمین کی صلاحیتوں کے مطابق آبادی، اقتصادی سرگرمیوں اور شہری توسیع کا منصوبہ بنانا ہے تاکہ پائیدار ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

پیداواری شہروں کے منصوبے کے بارے میں اُن کی ایک اہم تاکید یہ تھی کہ لوگوں کے ذہن میں یہ تصور پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ یہ دیہات کی طرف واپسی ہے۔ حتیٰ الامکان ان شہروں کو جدید ترین ٹیکنالوجی سے آراستہ کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اشیا کے انٹرنیٹ (IOT) کا بھی ذکر کیا، یعنی یہ شہر ایک چست شہر ہونا چاہیے۔ ہم ایک جدید، خود کفیل شہر کی بات کر رہے ہیں جس میں پسماندگی کا کوئی احساس نہ ہو، بلکہ لوگوں کی خواہش ہو کہ وہ ایسے شہروں میں رہیں۔ چست شہر کا مطلب یہ ہے کہ مثال کے طور پر گھر کی خاتون صرف ایک بٹن دبا کر زیرِ سطح آبپاشی کے ذریعے سات سو مربع میٹر کے گھر کو سیراب کر سکے۔

گزشتہ بیس برسوں کے دوران اُن کے ملک کے ٹیکنالوجی اور علم پر مبنی اداروں کے ساتھ وسیع روابط رہے۔ یہاں تک کہ ہمارا گروہ بھی اُن کے ذریعے علم و تحقیق پر مبنی مراکز اور اس شعبے کی متعدد اہم شخصیات سے متعارف ہوا۔ مزید برآں، مستقبل شناسی کے مطالعات (Futurology) سے باخبر رہنے کے لیے آقا مجتبیٰ اپنے ہم زلف ڈاکٹر رحمانی، جو مائیکروسافٹ کے سابق نائب صدور میں سے ایک تھے، کے ساتھ مسلسل علمی تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔

گویا آپ کو یہ احساس ہوتا کہ وہ ملک کے بعض اہم منصوبوں کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں اور مختلف ادارے بھی اس سلسلے میں ان کے ساتھ تعاون اور رابطے میں ہیں۔

جی ہاں، حقیقت یہ ہے کہ ان سے ہماری شناسائی ہماری پوری ٹیم پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص لطف تھا۔ آج «پیداواری شہر» کے بارے میں جو فکری و علمی ادبیات ہمارے پاس موجود ہے، اس کا بڑا حصہ انہی سے رابطے کے بعد وجود میں آیا۔ اس نشست میں آقا مجتبیٰ ہر موضوع پر نہایت باریک بینی کے ساتھ اپنی رائے پیش کرتے رہے۔ ہم اپنی مختلف پیشکشوں میں تمام مدیران اور ذمہ داران سے ایک سوال کیا کرتے تھے، اور وہ یہ تھا کہ: کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کے تمام شہروں اور دیہاتوں کا مجموعی رقبہ، ملک کے کل رقبے کا کتنے فیصد بنتا ہے؟ (یہ سوال زمین کی ذخیرہ اندوزی کے مسئلے سے متعلق تھا۔) ہم نے اس موضوع پر تقریباً ۱۱۰۰ نشستوں میں اپنی تحقیق پیش کی، لیکن ان تمام افراد میں صرف تین شخصیات ایسی تھیں جنہوں نے اس اہم سوال کا بالکل درست جواب دیا۔ ان تین میں سے ایک جناب سید مجتبیٰ تھے، جبکہ باقی دو انجینئر علی نیکزاد[1] اور علی اکبر محرابیان[2] تھے۔

جی ہاں۔ آقا مجتبیٰ ملک کی ان صلاحیتوں پر نظر رکھتے تھے جو در حقیقت ملک کے انفال میں شمار ہوتی ہیں، اور اسی وجہ سے وہ نئے پیداواری شہروں کے لیے ارضی منصوبہ بندی کے نظریے کو آگے بڑھا رہے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اگر نمونے کے طور پر ایک ہزار یونٹس پر مشتمل کسی رہائشی منصوبے کا سنگِ بنیاد رکھا جائے تو وہی مجموعہ ہمارے نظریات کی صداقت اور افادیت کی علامت بن جائے گا۔ عمودی تعمیرات کے مقابلے میں کم لاگت پر تعمیر بھی اس منصوبے کا ایک اور فائدہ ہے۔ مختصر یہ کہ ہم نے اپنا منصوبہ مکمل کر کے ان کی خدمت میں ارسال کیا۔ آقا مجتبیٰ نے بھی، اپنے الفاظ کے مطابق، اس منصوبے کے بارے میں اپنی سمجھ اور جمع بندی کو مئی ۲۰۲۱ء میں حضرت آقا کے سامنے پیش کیا۔ حضرت آقا نے بھی اس کا اس قدر استقبال کیا کہ فرمایا: «میں اس موضوع کے لیے ہر ماہ ایک مرتبہ اجلاس رکھنے کے لیے تیار ہوں۔» اس کے بعد آقا مجتبیٰ نے عملی اقدام کے لیے اسے فرمان امام اجرائی مرکز کی طرف بھیج دیا۔

---

(۱) انجینئر علی نیکزاد، موجودہ اسمبلی میں نائب اسپیکر اور دسویں حکومت میں وزیرِ رہائش و شہری ترقی۔

(۲) علی اکبر محرابیان، تیرہویں حکومت میں وزیرِ توانائی

جب ہماری پیشکش مکمل ہوئی تو انہوں نے نہایت تواضع کے ساتھ فرمایا: «ہم تو کافی عرصے سے پیداواری شہروں پر کام کر رہے ہیں۔»

خط: کیا آپ کے ذہن میں ہے کہ اس منصوبے کا کیا نتیجہ نکلا؟

یہ بدایت فرمانِ امام اجرائی مرکز کو دے دی گئی، لیکن ماہرین کے سرکاری نظام نے ایک مضبوط بند کی طرح اس کے سامنے مزاحمت کی، اور یہ حکم دفتری مراحل اور پیچیدگیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ البتہ شہید رئیسی کی حکومت کے دوران بھی آقا مجتبیٰ اس معاملے کی مسلسل پیروی کرتے رہے، یہاں تک کہ اس حکومت کے آغاز تک بھی انہوں نے شفقت کے ساتھ اس کی پیش رفت پر توجہ رکھی۔ تاہم ان کی ہدایت کے مطابق ہم نے میدانِ عمل سے مربوط تحقیقی کام کو معطل نہیں کیا بلکہ اسے آگے بڑھاتے رہے۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ہم کس طرح ایک ایسا خود مختار مگر مؤثر ادارہ بن سکتے ہیں جو ملک کے فیصلہ سازی کے نظام پر اثرانداز ہو۔ اسی مقصد کے لیے وہ ہمیں مسلسل مختلف اداروں اور شخصیات سے متعارف کراتے تھے تاکہ ہماری بات سنی جائے۔ بعض نشستوں میں تو ان کے اپنے ذمہ دار ساتھی بھی ہمارے ساتھ شریک ہوتے تھے تاکہ ہماری گفتگو کو زیادہ اہمیت اور توجہ ملے۔

خط: کیا آپ اپنے شعبۂ کار (یعنی شہری منصوبہ بندی) میں ایسے دوسرے گروہوں کو بھی جانتے ہیں جن کی سرگرمیوں پر بھی وہ نظر رکھتے تھے؟ مجھے یوں سمجھ آ رہی ہے کہ جیسے ہی آپ لوگوں نے اپنا کام نمایاں کیا، آپ ان کی توجہ میں آ گئے، پھر ملاقاتوں اور تعاون کا سلسلہ شروع ہو گیا؟

جی ہاں۔ امام حسین یونیورسٹی کے چند نوجوانوں نے زرعی پیداواری شہر کے بارے میں ایک منصوبہ آقا مجتبیٰ کے سامنے پیش کیا تھا۔ انہوں نے سفارش کی کہ وہ ہماری ٹیم کے ساتھ مربوط ہو جائیں۔ چنانچہ ہم نے اس گروہ کے ساتھ تعاون شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوشہر میں ۸۴۵ ہیکٹر اراضی پر ایک نمونہ منصوبہ تیار کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ہم اس منصوبے کے معمار تھے اور وہ اس کے عملی نفاذ کے ذمہ دار تھے، لیکن افسوس کہ یہ منصوبہ حالیہ حالات (مسلط جنگ) کی نذر ہو گیا۔ اس منصوبے میں ۲۳۰۰ رہائشی یونٹس شامل تھے، اور منصوبہ یہ تھا کہ ہر گھر میں جھینگے کی پرورش کے لیے آٹھ تالاب بنائے جائیں، تاکہ ہر خاندان آسانی سے سالانہ ڈیڑھ سے دو ارب تومان آمدنی حاصل کر سکے۔ اس ماڈل کی بنیاد رہبرِ معظم کی جانب سے سواحلِ مکران کی ترقی کے تصور پر تھی۔ وہ اس علاقے کی آبادکاری اور ترقی کے لیے مؤثر خیالات کے متلاشی تھے۔ ان کی ایک بڑی آرزو یہ تھی کہ اس خطے میں ایک کروڑ افراد کو آباد کیا جا سکے۔

گزشتہ بیس برسوں کے دوران ان کے ملک کے ٹیکنالوجی اور علم پر مبنی (دانش بنیان) اداروں اور ماہرین کے ساتھ نہایت قریبی روابط رہے۔ یہاں تک کہ انہی کی وساطت سے ہمارا گروہ بھی ان شعبوں کے اہم مراکز اور ممتاز شخصیات سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

آپ کی رائے میں، ان موضوعات پر ان کی گہری واقفیت سے ہٹ کر، کیا وہ اس میدان میں کسی مستقل نظریے کے بھی حامل تھے؟ خاص طور پر شہری منصوبہ بندی کے بارے میں میرے خیال میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا کوئی مستقل نظریہ تھا۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ ان کے پاس کچھ واضح معیارات اور اصول موجود تھے، جن میں تمدنی اور ثقافتی مطلوبیتیں بھی شامل تھیں۔ اسی لیے جب ہم کوئی بات پیش کرتے یا کوئی نمونہ تجویز کرتے تو وہ فوراً متوجہ ہو جاتے کہ کون سا حصہ ان اصولوں کے مطابق ہے اور کہاں انحراف پیدا ہو رہا ہے۔

خط: کیا آپ ان معیارات کی کچھ مثالیں بیان کریں گے؟

مثال کے طور پر، دنیا کے کسی بھی نظامِ اقدار میں خاندان پر اتنا زور نہیں دیا جاتا جتنا اسلامی جمہوریہ میں دیا جاتا ہے۔ وہ فرماتے تھے: میں چاہتا ہوں کہ آخرکار شہر اس انداز سے تعمیر ہو کہ خاندان بعنوان مرکز مضبوط ہو۔

آج پوری دنیا میں معاشرے کی سب سے چھوٹی اکائی فرد ہے اور کارخانہ، لیکن اسلامی جمہوریہ واحد ملک ہے جہاں معاشرے کی بنیادی اکائی خاندان کو قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ہمارے "پیداواری گھروں" کے منصوبے میں بعض لوگوں کی رائے تھی کہ گھر کی نچلی منزل میں ورکشاپ ہو اور اوپر رہائش گاہ۔ لیکن آقا مجتبیٰ فرماتے تھے: نہیں، گھر کا نقشہ اس طرح ہونا چاہیے کہ رہائشی حصہ اور ورکشاپ الگ الگ سمتوں میں ہوں؛ ان دونوں استعمالات کو ایک دوسرے میں نہیں ملانا چاہیے۔

ایک اور مثال غذائی تحفظ اور غیر عامل دفاع (Passive Defense) کی اہمیت ہے۔ غیر عامل دفاع کے حوالے سے آپ اسی رمضان کی جنگ کو دیکھ لیجیے۔ جب کوئی میزائل تہران میں گرتا ہے تو کثیر المنزلہ عمارتوں کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن جب حزب اللہ اسرائیلی حکومت کی شمالی بستیوں کو نشانہ بنائے تو تباہی نسبتاً کم ہوتی ہے، کیونکہ وہاں زیادہ تر مکانات کشادہ اور ایک منزلہ (ولا طرز) ہیں۔

خط: اگر آپ کو لگتا ہے کہ ان کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کوئی اور نکتہ بھی اہم ہے تو ضرور بیان فرمائیے۔

انہی جنگی ایام میں ایک دن ہم اپنے سابقہ اسکول کے چند دوستوں کے ساتھ جمع ہوئے۔ اب ان میں سے ہر ایک انجینئر، یونیورسٹی کا استاد یا ڈاکٹر ہے۔ یہ نشست اُس وقت ہوئی جب ابھی آقا مجتبیٰ کی قیادت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ اُس محفل میں ایک دوست، جو بالکل بھی حزب اللّٰہی رجحان نہیں رکھتا تھا، کہنے لگا: "ہم سب پڑھے لکھے لوگ ہیں، لیکن ہمارے دل آقا مجتبیٰ کی قیادت کی طرف مائل ہو رہے ہیں، حالانکہ نہ ہم نے ان کی کوئی تحریر پڑھی ہے اور نہ ہی ان کی آواز سنی ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی عقلوں پر اپنا خاص لطف فرمایا ہے۔" میرا خیال ہے کہ جس چیز نے اس معاملے کو واضح کیا، وہ وہ ذبحِ عظیم ہے جو پیش آئی اور جس کے نتیجے میں اسلام کے لیے عظیم فتوحات کی راہ ہموار ہوگی۔

دوست اس بات کے لیے پُرامید ہیں کہ اب ایک نئے شیخ بہائی کے دور کا آغاز ہوگا۔ یعنی وہ امید رکھتے ہیں کہ آقا مجتبیٰ ملک میں علم و ٹیکنالوجی کے میدان میں نئی پیش رفت اور نئی تنظیم کے ذریعے ایک نئے عہد کی بنیاد رکھیں گے، اِن شاء اللہ۔





آقا مجتبیٰ کی اولین ترجیح

ایک قریبی کارکن

انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے انتظامی طریقہ کار پر ان کے ایک قریبی کارکن سے گفتگو

انٹرویو دینے والے کا نام ذکر نہ کرنے کی وجہ صرف حفاظتی احتیاط ہے، جس کی جائے گی۔ ایسے دور میں جب ہمارا شر انگیز دشمن دہشت گردی کو اپنا شیوہ بنا چکا ہے اور ہم خود دنیا میں دہشت گردی کے سب سے بڑے متاثرین میں شمار ہوتے ہیں، اس قسم کی احتیاط نہ صرف غیر ضروری یا حد سے زیادہ محتاط رویہ نہیں، بلکہ بہت سے مواقع پر ایک ذمہ دارانہ اور ناگزیر اقدام ہے۔

خط: ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے خط پر اعتماد کرتے ہوئے اس گمنام انٹرویو کے لیے رضامندی ظاہر فرمائی۔ براہِ کرم جناب سید مجتبیٰ سے اپنی آشنائی کی مختصر تاریخ بیان فرمایے۔

میں.... یونیورسٹی میں علمی ہیئت کا رکن ہوں۔ سن ۲۰۱۰ میں بسیج سے متعلق ایک منصوبے کے سلسلے میں میری آقا مجتبیٰ سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اُس وقت میں شریف یونیورسٹی میں ایرو اسپیس انجینئرنگ کے شعبے کا انڈر گریجویٹ طالب علم تھا۔ سن ۲۰۱۲ میں ہمارا خاندانی تعلق بھی قائم ہوا، جس کے باعث یہ رابطہ کچھ زیادہ قریبی ہو گیا۔ یہ تعلق مسلسل برقرار رہا، یہاں تک کہ جس دن آقا شہید ہوئے۔ اس کے بعد یہ رابطہ بھی منقطع ہو گیا۔

ان پندرہ برسوں میں اوسطاً ہر سال تقریباً پندرہ سے بیس نشستوں میں مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ عمومی اور

فکری موضوعات کے علاوہ میری زیادہ تر ملاقاتیں علمی و نخبگانی امور کے حوالے سے ہوتی تھیں؛ یعنی اُن معاملات میں جو رائج معنوں میں علمی و جامعاتی نخبگان اور ممتاز محققین سے متعلق ہوتے تھے، خواہ وہ ان سے ملاقات کرتے، انہیں کوئی منصوبہ پیش کرتے یا میں خود ایسے روابط کا واسطہ بنتا۔ در حقیقت میرا ان سے زیادہ گہرا تعلق علمی نخبگان، ٹیکنالوجی اور بنیادی علوم کے میدان میں تھا، اور میری شناخت بھی اسی حوالے سے قائم ہوئی۔

میں ان کے بعض دیگر روابط سے بھی آگاہ تھا۔ نظام کے بعض نہایت خاص اور خفیہ عسکری منصوبے، جن کا فوجی دفاتر میں بھی زیادہ ظاہر ہونا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا، ان کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔ ان منصوبوں سے وابستہ مخصوص افراد، مثلاً جہادِ خودکفائی کے بعض معاونین یا سپاہ کے بعض ذمہ داران، ان سے براہِ راست رابطہ رکھتے تھے۔ ایسے دو تین معاملات کی مجھے ذاتی اطلاع ہے؛ ان میں سے ایک میں خود میں واسطہ تھا، جبکہ دو تین دیگر کے بارے میں اتفاقاً آگاہی حاصل ہوئی۔

وہ ملک کے بعض حساس سکیورٹی معاملات میں بھی کردار رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک نہایت اہم انٹیلی جنس معاملہ ایسا تھا جس میں سپاہ کی انٹیلی جنس تنظیم اور وزارتِ اطلاعات کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس اختلاف کے حل کے لیے حاج آقا کو متعلقہ انٹیلی جنس اداروں کی جانب سے منتخب کیا گیا تھا۔ ملک کے انٹیلی جنس حکام ترجیح دیتے تھے کہ ان معاملات میں انہی کے ساتھ کام کریں، اسی لیے وہ مسلسل ان سے رجوع کرتے اور ان کے پاس آتے جاتے رہتے تھے۔ خود ان میں بھی اس نوعیت کی ذمہ داری سنبھالنے کی خاص صلاحیت اور آمادگی موجود تھی۔

خط: آقا مجتبیٰ کن شعبوں میں سرگرم تھے اور کن امور کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر خود دہال کرتے تھے؟

ان پندرہ برسوں کے دوران ان کی غالب سوچ اور اولین ترجیح خود کفالت (استقلال) تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم دفاعی ساز و سامان میں خود کفیل ہوں اور اپنی حفاظت خود کر سکیں، خوراک میں خود کفیل ہوں تاکہ عوام کی ضروریاتِ معیشت پوری کر سکیں، ادویات میں خود کفیل ہوں، اور اسی طرح دوسرے شعبوں میں بھی۔ خود کفالت ان کی بنیادی فکر تھی۔ وہ خود کفالت کو ایک نہایت عملی، عینی اور حقیقی مسئلہ سمجھتے تھے اور اس موضوع پر نظریاتی بحثوں یا اختلافات میں زیادہ نہیں پڑتے تھے۔ ان کے لیے اصل سوال یہ تھا کہ خود کفالت عملی طور پر، زمین پر، کس صورت میں محقق ہوگی۔ مثلاً عوام کی غذائی ضروریات کے شعبے میں، خوراک کیا ہے، غذائی ٹوکری کی نوعیت کیا ہے، وزارتِ صحت کا نقطۂ نظر کیا ہے، کن اشیاء میں ہماری اندرونی پیداوار موجود ہے، کن میں ہم بیرونی انحصار رکھتے ہیں، اور اس نوعیت کے دیگر معاملات پر انہیں حیرت انگیز حد تک تفصیلی معلومات حاصل تھیں۔ میں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میں بطور ایک یونیورسٹی استاد، بغیر کسی مبالغے کے، اس بات پر شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اگر آپ وزارتِ جہادِ کشاورزی کے وزراء یا متعلقہ اعلیٰ حکام کو ان کے ساتھ بٹھائیں اور ان سے معلومات طلب کریں، تو دیکھیں گے کہ کس کی معلومات زیادہ جامع اور دقیق ہیں۔ مثلاً پوچھیں کہ ہمارے ملک میں گندم کی کتنی اقسام کاشت ہوتی ہیں؟ کون سے علاقے میں کیا کاشت ہوتا ہے؟ پیداوار کتنی ہے؟ ہمارے پاس مویشیوں کی کون کون سی نسلیں ہیں؟ فلاں نسل کی خوراک کیا ہے؟ ہمارے آبی ذخائر کہاں واقع ہیں اور ان کی صورتحال کیا ہے؟ پانی کے مسئلے کی حقیقت کیا ہے؟ حاج آقا ان تمام امور پر نہایت تفصیلی دسترس رکھتے تھے۔

اسی طرح تیل اور گیس کے شعبے میں بھی بعض مواقع پر انہیں اس پورے معاملے کے کیمیائی پہلوؤں تک کا علم تھا۔ مثال کے طور پر وہ

جانتے تھے کہ ریفائنری میں خام تیل پر کون سا عمل انجام پاتا ہے، اس سے حاصل ہونے والی پانچ بنیادی مصنوعات کون سی ہیں، پیٹرو کیمیکل صنعت میں ان کا آگے کیا استعمال ہوتا ہے، اور اس طرح کے دیگر مراحل سے بھی وہ انتہائی باریک بینی کے ساتھ واقف تھے۔

خط: حاج آقا مجتبیٰ نے اپنے پیغام میں ملک کے مسائل کے حل کے لیے ایک منصوبے کا ذکر کیا ہے۔ کیا آپ کو اس کے بارے میں کوئی معلومات ہیں؟

مجھے اس منصوبے کی تفصیلات کا علم نہیں، لیکن حضرت آقا سے اپنی طویل آشنائی کی بنیاد پر میرا اندازہ یہ ہے کہ اس سے مراد پانی، خوراک، ادویات و صحت، رہائش اور توانائی جیسے بنیادی شعبوں سے متعلق ایک جامع اور تفصیلی منصوبہ ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے ان شعبوں کے تمام جامعاتی ماہرین سے ملاقات کی ہے، لیکن یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہر شعبے کے نمایاں اور ممتاز ماہرین کی ایک قابلِ توجہ تعداد کو انہوں نے دعوت دی، ان کی آراء سنیں اور ان کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی۔ مثلاً زرعی شعبے میں اگر یہ سنا کہ جامعۂ تہران کے پردیسِ فارابی کے کسی استاد کو اس میدان میں اعلیٰ مہارت حاصل ہے، تو انہیں بلایا۔ اسی طرح توانائی اور تیل کے شعبے میں اگر جامعۂ شریف کے کسی ممتاز استاد کی علمی صلاحیت اور مہارت کا ذکر ہوا، تو انہیں بھی دعوت دی، ان کے ساتھ نشست کی اور مختلف موضوعات پر تفصیلی تبادلۂ خیال کیا۔

نظام کے بعض نہایت حساس اور خفیہ دفاعی و عسکری منصوبے، جن کا انکشاف حتیٰ کہ عسکری دفاتر میں بھی مصلحت کے خلاف سمجھا جاتا تھا، حضرت آقا مجتبیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے تھے۔

خط: کیا انہی موضوعات کے حوالے سے شہید رہبر کے ساتھ ان کے تعلق اور باہمی تعامل کے بارے میں بھی آپ کو کچھ معلومات ہیں؟

ایک مرتبہ انہی موضوعات کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا: "میں نے ایک موقع پر ان مسائل کے بارے میں حضرت آقا سے عرض کیا کہ میری سمجھ یہ ہے اور میں ان امور کے بارے میں شدید احساسِ ذمہ داری رکھتا ہوں۔" اس پر حضرت آقا نے فرمایا: "جب تک تم میں جان، طاقت اور ہمت ہے، انہی کاموں کو جاری رکھو!" یعنی گویا ان شعبوں میں ان کے ذمے ایک خاص ذمہ داری تھی، اور ان کی کوششوں کے نتائج حضرت آقا تک پہنچائے جاتے تھے۔

ایک اور موقع پر انہوں نے اپنے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: "میرا کوئی سرکاری یا انتظامی منصب نہیں کہ میں براہِ راست مداخلت کروں۔ پہلے زمانے کی خواتین جب اپنے بیٹوں کے لیے رشتہ تلاش کرتی تھیں تو مجالسِ عزا یا مذہبی اجتماعات میں جاتی تھیں، وہاں مناسب خاندانوں سے تعارف ہوتا، تعلقات بنتے اور اسی طرح رشتے طے ہو جاتے تھے۔ میرا کام بھی کچھ اسی طرح ہے۔ یہاں منعقد ہونے والی مجالس، حسینیہ کی نشستوں اور بعض نسبتاً خصوصی ملاقاتوں میں میں مناسب افراد کو ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہوں۔"

وہ یہ کام بہت کثرت سے انجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر بنیادِ اقتصادی کوثر کے کسی ایسے مدیر کو، جو غذائی پیداوار کے شعبے میں کام کر رہا ہو، کسی ایسے جامعہ کے استاد سے متعارف کراتے جو بیجوں، ان کی اصلاح یا ان کے جلد اور بہتر اگاؤ (Germination) پر تحقیق کر چکا ہو۔ یا پھر غذا و ادویات کے شعبے کے کسی مدیر کو اس محقق سے ملاتے جس نے کسی مخصوص دوا پر علمی تحقیق کی ہو۔

میں نے خود بھی علمی و جامعاتی نخبگان کے میدان میں اس طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا ہے۔

اس نوعیت کے منصوبے رسمی سرکاری سلسلہ مراتب کے ذریعے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مثلاً مجمعِ تشخیصِ مصلحتِ

نظام کے لیے کوئی سرکاری ہدایت یا ایجنڈا مقرر کرتے ہوں، کیونکہ ان کے پاس ایسا کوئی رسمی منصب نہیں تھا۔ البتہ وہ نہایت مؤثر انداز میں تسہیل کار (Facilitator) کا کردار ادا کرتے، مناسب افراد کو ایک دوسرے سے ملاتے اور انتہائی ہدفی و دقیق انداز میں مختلف صلاحیتوں کو باہم مربوط کرتے تھے۔

خط: وہ کن امور میں بالکل مداخلت نہیں کرتے تھے؟

مثلاً اس بات میں کہ مجلس کسی ادارے، وزارت، سرکاری محکمے یا کسی خاص شعبے کے لیے بجٹ منظور کرے یا نہ کرے۔ یعنی ملک کے مالی اور بجٹ سے متعلق انتظامی معاملات میں وہ مداخلت نہیں کرتے تھے۔

خط: ملک کے بڑے اور بنیادی معاملات کے بارے میں ان کے طرزِ فکر کی کوئی مثال آپ کے ذہن میں ہو تو بیان فرمائیں۔

ایک مثال جو آج بھی ملک میں خاصی موضوعِ بحث ہے، حکومت کے حجم کو کم کرنے (Downsizing of Government) کا مسئلہ ہے۔ مختلف گروہوں نے اس موضوع پر بارہا کام کیا اور اس قدر فضا بنائی کہ گویا سب کا متفقہ مؤقف یہی ہے کہ حکومت کو چھوٹا کر دینا چاہیے۔

لیکن حضرت آقا مجتبیٰ اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ حکومت کا حجم کم کرنا، انتظامی چابکی (Efficiency) پیدا کرنے سے کوئی لازمی تعلق نہیں رکھتا۔ بلاشبہ ہمیں نظامِ حکومت کو زیادہ مؤثر اور چابک بنانے کی ضرورت ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حکومت کو چھوٹا کر دیا جائے اور عوام کی خدمت و ذمہ داریوں کو کم کر دیا جائے؛ کیونکہ حکومت تمام عوام کی امانت اور ان کی خدمت کے لیے ہوتی ہے۔

ان پندرہ برسوں کے دوران ان کی غالب فکر اور اولین ترجیح ہمیشہ ایک ہی چیز رہی: "استقلال" (خود انحصاری و خود مختاری)۔

خط: یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت آقا مجتبیٰ بدعنوانی (فساد) کے خلاف جدوجہد کو بہت سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

ان کے نزدیک انحرافات کی بنیادی وجہ افراد کی ذاتی بدعنوانیاں ہوتی ہیں، خصوصاً معاشی بدعنوانی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ایسے افراد کے ساتھ سختی سے نمٹا جانا چاہیے۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے عرض کیا: "حاج آقا! اگر آپ کی بات پر عمل کیا جائے تو ملک میں خونریزی ہو جائے گی۔" انہوں نے جواب دیا: "تو ہو جائے؛ ہم یہاں اسی لیے ہیں کہ فساد کا خاتمہ کریں۔"

ان کے نزدیک معاشی بدعنوانی، بالخصوص وہ بدعنوانی جس کا تعلق ذاتی مفادات سے ہو، ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر قیمت پر کارروائی ہونی چاہیے۔ وہ ذہنی طور پر اس بات کے قائل تھے کہ خواہ اس کی قیمت کچھ بھی ادا کرنی پڑے، اس کے خلاف اقدام ضروری ہے، اور اسے اپنی اولین ترجیحات میں شمار کرتے تھے۔

انقلابی حلقوں میں ایک معروف روایت یہ رہی ہے کہ ملک میں منظم معاشی فساد کی جڑیں ۱۹۹۰ء کی دہائی میں آقای ہاشمی اور حزبِ کارگزاران کی پالیسیوں سے جا ملتی ہیں؛ یعنی بعض لوگ بدعنوانی کو ایک مخصوص سیاسی دھارے سے منسلک کر کے دیکھتے ہیں۔

لیکن حضرت آقا مجتبیٰ کا زاویۂ نگاہ مختلف تھا۔ وہ افراد کو ان کی وابستگی کی بنیاد پر نہیں، بلکہ ان کے کردار کی بنیاد پر پرکھتے تھے؛ خواہ وہ کارگزاران سے تعلق رکھتے ہوں یا، ان کے اپنے الفاظ میں، "سوپر انقلابی" ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا۔ فرمایا کہ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں ایک دن حضرت آقا کی اقتدا میں نماز کے بعد، دو ایسے افراد جو آج کی اصطلاح میں "سوپر انقلابی" کہلاتے، ایک طرف بیٹھے تھے، جبکہ حزبِ کارگزاران کا ایک رکن بھی وہاں موجود تھا۔ حضرت آقا نے نمازِ ظہر ادا کرنے کے بعد نوافلِ عصر شروع کیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص، جسے یہ لوگ منافق سمجھتے تھے، کھڑا ہو کر خاموشی سے اپنی نوافل ادا کر رہا تھا، جبکہ یہ دونوں بیٹھے اسی کی غیبت کر رہے تھے۔

پھر انہوں نے اس شخص کا نام لے کر فرمایا: "وہ ایک صالح اور دیانت دار انسان ہے۔ اس کا سیاسی رجحان کارگزاران کی طرف

ہے، لیکن وہ نہ بدعنوان ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ناجائز منفعت حاصل کرتا ہے۔"

حضرت آقا مجتبیٰ بدعنوانی کے خلاف جدوجہد میں نہایت مضبوط، فیصلہ کن اور کسی مصلحت سے بالاتر رویہ رکھتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ لوگ اس خصوصیت کو واضح طور پر محسوس کریں گے۔

وہ استقلال (خود مختاری) کو ایک عملی، عینی اور حقیقی حقیقت کے طور پر دیکھتے تھے، نہ کہ محض ایک نظری یا تجریدی تصور کے طور پر۔ اسی لیے وہ استقلال کے بارے میں نظری مباحث، فکری اختلافات یا محض علمی بحثوں میں زیادہ نہیں پڑتے تھے۔

خط: افرادی قوت کی تربیت (کیڈر سازی) کے حوالے سے ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟

اگر میں افرادی قوت کی تربیت (کیڈر سازی) کے بارے میں ان کے تصور کو بیان کروں تو میرا خیال ہے کہ ان کے نزدیک اس کا بنیادی محور وہ مراکز اور حلقے ہیں جو دینی اعتبار سے اعلیٰ درجے کی طہارت، اخلاص اور معنویت رکھتے ہوں۔ یہ مراکز ایک اچھا مدرسہ، بسیج کا فعال مرکز، کوئی ثقافتی ادارہ، ایک مذہبی ہیئت، ایک کامیاب کمپنی یا ایک مضبوط تحقیقی ادارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان اداروں کی رسمی یا قانونی حیثیت بنیادی اہمیت نہیں رکھتی، بلکہ اصل معیار ان کی دینی و فکری صلاحیت اور تربیتی اثر ہے۔

ملک بھر میں اس نوعیت کے بے شمار متنوع مراکز موجود ہیں جو افرادی قوت کی تربیت (کیڈر سازی) کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر کام لازماً سرکاری اور رسمی اداروں کے ذریعے انجام دیا جائے۔ مثال کے طور پر اگر آپ وزارتِ تعلیم میں افرادی قوت کی تربیت (کیڈر سازی) کی بات کریں تو بعض لوگ کہیں گے: "یہ صرف ہماری ذمہ داری ہے؛ ہم ہی یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ کسی دوسرے کو اس میدان میں آنے کا حق نہیں، کیونکہ یہ متوازی کام ہوگا، جبکہ قانوناً یہی ذمہ داری ہماری ہے۔"

آقا مجتبیٰ کا رجحان پہلے نقطۂ نظر کی طرف تھا اور وہ ایسے تربیتی و فکری مراکز کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے۔ ان کی نمایاں ترجیحات میں سے ایک یہ تھی کہ افرادی قوت کی تربیت (کیڈر سازی) کا عمل انہی مؤثر مراکز کے ذریعے آگے بڑھایا جائے۔ اسی مقصد کے لیے وہ اپنی استطاعت کے مطابق ہر ممکن تعاون اور مدد فراہم کرتے تھے۔

خط: اسی تناظر میں سیاسی جماعتوں اور سیاسی گروہوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟

سیاسی جماعتوں کے بارے میں میری ان سے کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔ البتہ ملک میں پیش آنے والے سیاسی حالات اور واقعات کے بارے میں ان کا زاویۂ نظر نہایت کشادہ تھا۔ سیاسی میدان میں مختلف افراد کے آگے آنے اور باہمی سیاسی رقابت کے امکان کو وہ اُس سے کہیں زیادہ وسعت کے ساتھ دیکھتے تھے جتنا عملاً ملک میں رائج تھا۔

خط: ایک موقع پر انہوں نے فرمایا تھا: "میں نے تاریخ کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔" بظاہر کم عمری ہی سے تاریخ ان کے اہم ترین مطالعاتی موضوعات میں شامل رہی ہے۔ ان کے پیغامات میں بھی تاریخ پر یہ گہری توجہ کسی حد تک نمایاں نظر آتی ہے۔ آپ کی ان سے ہونے والی ملاقاتوں میں کیا آپ نے تاریخ کے بارے میں ان کا کوئی منفرد زاویۂ نظر محسوس کیا؟

گزشتہ دو صدیوں میں عالمِ اسلام پر گزرنے والے حالات کے بارے میں ان کی اپنی ایک مخصوص تاریخی تعبیر تھی۔ مثلاً وہ اس بات کا گہرا تجزیہ رکھتے تھے کہ فرانس کی مصر میں آمد کے بعد کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں، روسیوں نے سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا، برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی برصغیر میں کس نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف تھی، اور اسی طرح کے دیگر تاریخی موضوعات۔

انہوں نے مجھے متعدد اہم تاریخی کتابیں اور مراجع بھی تجویز کیے اور فرمایا کہ انہیں ضرور مطالعہ کرو۔ ان کے بعض فکری اور عملی ابتکارات کی بنیاد بھی دراصل خطے میں مسلمانوں کی معاصر تاریخ پر ان کی گہری بصیرت اور وسیع اشراف تھی۔ صہیونی حکومت کے بارے میں بھی انہوں نے نہایت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔

خط: عوام کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیسا تھا؟

حاج آقا ہر معاملے کو عوامی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ طرزِ فکر ان کی تحریروں اور بیانات کے الفاظ میں بھی نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ معاشی تبدیلی کو بھی ایک عوامی عمل سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک ایسا نہیں تھا کہ عوام صرف ثقافتی سرگرمیوں، جیسے مذہبی مجالس (ہیئت) کے انعقاد تک محدود رہیں، جبکہ پیداوار اور اقتصادی سرگرمیاں صرف بڑے صنعتی یا سرمایہ دارانہ اداروں کے سپرد ہوں۔ ہرگز ایسا نہیں تھا۔

مثال کے طور پر غذائی تحفظ کے بارے میں ان کا نظریہ یہ نہیں تھا کہ ملک کی غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے صرف چند بڑے زرعی و صنعتی منصوبوں یا سرمایہ دارانہ زرعی اداروں پر انحصار کیا جائے۔ بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ خوراک کی پیداوار بھی عوام کے ہاتھ میں ہونی چاہیے، اور یہ ذمہ داری صرف دیہی آبادی تک محدود نہیں ہونی چاہیے۔

میں خود ایک ایسے منصوبے سے آگاہ تھا جس کی وہ پیروی کر رہے تھے۔ اس میں یہ جائزہ لیا جا رہا تھا کہ آیا انہی بڑے شہروں میں خوراک کی پیداوار کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہاں خوراک کی پیداوار سے مراد اس کا وسیع مفہوم تھا۔ مثلاً کیا جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے شہری کچرے کو اس انداز سے جمع اور پروسیس کیا جا سکتا ہے کہ وہ زرعی کھاد، مٹی کی تیاری، کاشت کے لیے مناسب بستر اور اس نوعیت کی دیگر ضروریات میں تبدیل ہو جائے؟

ذاتی زندگی میں بھی ان کا عوام سے براہِ راست رابطہ تھا۔ اس کی ایک مثال وہی ٹیکسی والا واقعہ ہے جس کا وہ خود ذکر کرتے تھے اور جو کئی برسوں تک جاری رہا۔ اسی طرح وہ زیارتِ اربعین میں بھی شریک ہوتے تھے، اور اپنے دوستوں کے ساتھ مختلف فلاحی اور خیراتی سرگرمیوں میں بھی عملی حصہ لیتے تھے۔

پیغامات کے بارے میں جو بھی کیفیت اور احساس ان سے محسوس ہوتا ہے، وہ بالکل خود اُن کی اپنی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے: ایک اپنائیت، دل نشینی، مہربانی، سادگی اور کچھ حد تک عالمانہ رنگ۔

خط: خدمت محرومین کے بارے میں مزید وضاحت فرمائیں! بظاہر یہ معاملہ اُن کی زندگی کی ایک اہم ترجیح اور فکر ہے۔

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ انہوں نے فلاحی کاموں کا آغاز کیا۔ مجھے بھی وہ بہت تاکید کرتے تھے کہ محرومین کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کے کام میں شامل رہوں، لیکن میں یونیورسٹی کے کاموں، علمی سرگرمیوں، نخبہ افراد سے متعلق امور، ٹیکنالوجی اور سائنس کی نشستوں وغیرہ میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب چاہتے تھے کہ یہ بات میرے ذہن سے نہ نکل جائے تو دو تین مرتبہ مجھ سے کہتے تھے: محرومین کی خدمت کو معمولی نہ سمجھو، اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے؛ باقی کام بھی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔

خط: ایک ایسے شخص کے طور پر جو کئی سال تک ان کے ساتھ رابطے میں رہا، آپ ان کے پیغامات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کے خیال میں ان پیغامات کو پڑھ کر مخاطب کس حد تک آقا مجتبیٰ کی شخصیت کے قریب ہو جاتا ہے؟

پیغامات کے بارے میں جو بھی کیفیت اور احساس ان سے حاصل ہوتا ہے، وہ بالکل خود ان کی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے: صمیمیت، دل نشینی، مہربانی، سادگی، آسان مزاجی اور کچھ حد تک عالمانہ رنگ

اور علمی ذوق رکھنے والی طبیعت۔ یہ سب چیزیں ان پیغامات میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

خط: اگر ان کی ذاتی زندگی سے متعلق کوئی یاد ہو تو بیان فرمائیں!

مجھے صحیح طور پر یاد نہیں، شاید سنہ ۱۳۹۷ (۲۰۱۸ء) کی بات ہے کہ پھل مہنگے ہو گئے تھے۔ وہ کہتے تھے: زرد آلو بہت مہنگا ہے اور خریدا نہیں جا سکتا، لیکن میں پھر بھی ایک زرد آلو خریدتا ہوں تاکہ بچہ ایک زرد آلو کھا لے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے اس پھل کو اسی موسم میں پیدا کیا ہے، تم بھی ایسا ہی کرو۔

وہ اسی طرح زندگی گزارتے تھے اور اب بھی اسی انداز پر قائم ہیں۔

خط: آخری سوال کے طور پر، جب خود اُن کے بارے میں قیادت کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو اُن کا ردِ عمل کیا تھا؟

شہادتِ سید حسن نصر اللہ کے بعد ایک نشست میں جامعۂ تہران سے کچھ افراد اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک عزیز نے نشست کے آغاز ہی میں اچانک آقا مجتبیٰ سے اپنی عقیدت کا اظہار شروع کر دیا اور کہا:

"جب سید حسن نصر اللہ کی شہادت کی خبر ملی تو میری حالت بہت خراب ہو گئی تھی، یہاں تک کہ جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے سکون ملا۔"

پھر وہ بار بار کہنے لگے کہ: "اب آقا کے بعد میری عقیدت آپ ہی سے ہے" اور اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔

آقا مجتبیٰ نے ابتدا میں فرمایا کہ بحث کو آگے بڑھاتے ہیں، لیکن وہ شخص خاموش نہ ہوا۔ آخر کار آقا مجتبیٰ نے قدرے سخت لہجے میں فرمایا:

"آپ کو اس موضوع کے بارے میں اتنا علم نہیں ہے کہ اس پر رائے دیں؛ علمِ رجال میں بھی آپ کی مہارت کمزور ہے، اور اب آپ قیادت کے انتخاب کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"

معیار، اجتماعی تقویٰ سے مشروط

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ (الاعراف:۹۶)

"اور اگر بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ضرور ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے، لیکن انہوں نے (ہماری آیات کو) جھٹلایا، تو ہم نے انہیں ان کے اعمال کی سزا میں گرفتار کر لیا۔"

یہ آیت ہماری بعض نعمتوں کے ہمارے اپنے اعمال کی بنا پر سلب ہونے کے بارے میں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان اور تقویٰ موجود ہو تو اللہ کی برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ لیکن اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ بعض اوقات کوئی اثر، جیسے دشمن پر فتح و کامیابی، انفرادی تقویٰ سے نہیں بلکہ اجتماعی تقویٰ سے مشروط ہوتی ہے۔ ممکن ہے کسی اجتماع میں ایک شخص ایسا ہو جو سب سے زیادہ متقی ہو، لیکن وہ پورا اجتماع مجموعی طور پر تقویٰ والا اجتماع نہ ہو۔

۲۴ر فروری ۲۰۱۸



وصی، معاشرے کی روح

آیت اللہ محمد رضا عابدینی

یادداشت

"وصایت کا تاریخی تسلسل: حضرت آدم سے لے کر عصرِ غیبت کی نیابتِ عامہ تک" آیت اللہ محمد رضا عابدینی

سنتِ وصایت کا آغاز: ہابیل اور قابیل کا واقعہ

ہمارے پاس "وصایت" کی ایک سنت موجود ہے، اور یہ سنت ہماری روایات اور آیات میں نہایت خوبصورت انداز سے بیان ہوئی ہے۔ انسانی تاریخ کے ابتدائی افراد، یعنی حضرت آدمؑ اور ان کی اولاد سے ہی اس کا آغاز ہوتا ہے۔ جب قرآن کریم قربانی کے واقعے کو بیان کرتا ہے: ﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ إِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾[1] "قابیل اور ہابیل دونوں نے قربانی پیش کی۔ سوال یہ ہے کہ یہ قربانی کس مقصد کے لیے تھی؟ امرِ وصایت حضرت آدمؑ کی اولاد میں قرار پانے والا تھا، اور اس کا انتخاب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں تھا۔ خدا کی طرف سے انتخاب کا معیار یہ رکھا گیا کہ دونوں میں سے ہر ایک اللہ کی راہ میں اپنی قربانی پیش کرے، پھر اللہ تعالیٰ جس کے اندر اخلاص، پاکیزگی، وفاداری اور وصایت کی اہلیت پائے گا، اسے منتخب فرمائے گا۔

پہلے وصی کا قتل

جب دونوں نے قربانیاں پیش کیں: ﴿فَتُقُبِّلَ مِنْ أَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْآخَرِ﴾ پس ان دونوں میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ نقل کیا گیا ہے کہ ہابیل بھیڑ بکریاں پالنے والے تھے اور قابیل کھیتی باڑی کرتے تھے۔ طے یہ تھا کہ قابیل اپنی بہترین فصل کے خوشے پیش کرے گا اور ہابیل اپنے ریوڑ کا بہترین جانور قربانی کے لیے لائیں گے۔ جب دونوں قربانی لے کر آئے تو قابیل کے اندر یقین اور اخلاص کی کمی تھی، اس لیے اس نے درمیانے درجے یا کمزور اناج پیش کیا۔ لیکن ہابیل نے اپنے ریوڑ کا بہترین جانور محبت اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا۔ ذرا غور کریں، یہ سب ان حقیقتوں کی علامتیں ہیں کہ انسان کا اللہ پر یقین جتنا مضبوط ہوتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں اپنی بہترین چیز پیش کرنے کے لیے اتنا ہی آمادہ ہوتا ہے؛ یہاں تک کہ وہ اپنی جان تک خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی قربانی وصی کی جان ہوتی ہے، جو اللہ کی راہ میں پیش کی جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ ہمارے شہید امام نے اپنی جان اور اپنے سب سے قیمتی سرمایہ کو خدا کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کیا، اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا: ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ﴾[2] یہاں قابیل کی قربانی قبول نہ ہوئی، جس کے نتیجے میں اس کے دل میں ہابیل کے خلاف کینہ اور دشمنی پیدا ہوئی، اور آخر کار قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل واقع ہوا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں پہلے وصی کو قتل کیا گیا؛ پہلے وصی نے شہادت پائی۔

تمام لوگوں کا احیا، وصایت کے ذریعے

زمین پر خدا کے پہلے وصی کو پہلے قتل کی دھمکی دی گئی اور پھر وہ شہید کر دیے گئے۔ وصایت کا آغاز ہی شہادت سے ہوا، یہ بات

---

(۱) ترجمہ: اور انہیں آدم کے دو بیٹوں کا سچا واقعہ سناؤ، جب دونوں نے قربانی پیش کی۔ سورۂ مبارکہ مائدہ، آیت ۲۷

(۲) "پس اس کے رب نے اسے بہترین قبولیت کے ساتھ قبول فرمایا..." سورۂ آل عمران، آیت ۳۷

بہت خوبصورت ہے۔ اس کے بعد ایسی آیات نازل ہوئیں جن میں فرمایا گیا کہ بنی اسرائیل کے لیے اسی وصی کے قتل کے واقعے کی وجہ سے یہ قانون مقرر کیا گیا: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾[1] اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾[2] وصی کا کام لوگوں کی ہدایت کرنا اور تمام انسانوں کو حیات عطا کرنا ہے، جبکہ وصی کے مقابلے میں کھڑا ہونا گویا تمام انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ یعنی معاشرے کی زندگی اور موت کا تعلق وصی سے وابستہ ہے۔

زمین کا استحکام، وصیِ الٰہی کے ذریعے

جب ہابیلؑ شہید ہو گئے تو حضرت آدمؑ بہت غمگین ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ کرتے تھے؛ لیکن یہ غم صرف اپنے بیٹے کے لیے نہیں تھا بلکہ اس لیے تھا کہ وصیِ الٰہی شہید کر دیے گئے تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کچھ عرصے بعد حضرت آدمؑ کو شیثؑ عطا فرمایا، جن کا لقب ہی "ہبۃُ اللہ" ہے؛ یعنی اللہ کی عطا اور خدا کا تحفہ۔ قابیل اور قابیل کے پیروکار جو ایک گروہ اور طاقت بن چکے تھے، کہتے تھے: اگر تم وصایت کا اظہار کرو گے تو ہم تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔ جب امرِ وصایت کو خطرہ لاحق ہوا تو اوصیاء کا یہ سلسلہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا۔ روایات میں آیا ہے کہ اولیاء دو قسم کے ہوتے ہیں: اوصیائے مُستَعلِن (ظاہر و آشکار) اور اوصیائے مُستَخفی (پوشیدہ و مخفی)۔

تاریخ کے تمام ادوار میں وصایت کا سلسلہ موجود رہا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ یہ سلسلہ کبھی منقطع ہو؛ کیونکہ زمین کا استحکام وصیِ الٰہی کے وجود سے ہے۔ چونکہ زمین کی بقا اسی امر سے وابستہ ہے، اس لیے ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ کائنات موجود ہو اور اس میں وصیِ الٰہی موجود نہ ہو۔ اسی لیے کائنات میں آنے والا پہلا انسان، یعنی حضرت آدمؑ، اللہ کی طرف سے حجت قرار پائے، اور کائنات سے جانے والا آخری انسان بھی وصیِ الٰہی ہی ہونا چاہیے۔

پوری تاریخ میں وصایت کا دن

یہ اللہ تعالیٰ کی ایک قطعی سنت ہے کہ انسان کی بقا اس وصایت کے وجود سے وابستہ ہے: ﴿لَوْلَا الْحُجَّةُ لَسَاخَتِ الْأَرْضُ بِأَهْلِهَا﴾[3] انسان کو حیوان سے ممتاز کرنے والی حقیقت یہی وصایت اور نبوت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پوری تاریخ میں جاری رکھا ہے۔ اسی زمانے سے حضرت آدمؑ کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ سال میں ایک دن ایسا مقرر کریں جس میں امرِ وصایت کا اظہار کیا جائے۔ ہر سال اس دن وصایت کے امر، وصایت کی سنتوں اور وصایت کے ورثے کو پیش کیا جاتا، لوگ جمع ہوتے، خوشی مناتے اور اس دن کو عظمت و احترام کے ساتھ یاد کرتے۔ تاریخ میں اس دن کی تطبیق تقریباً ۱۸ ذی الحجہ ہے، یعنی عیدِ غدیر کا دن۔ اسی لیے غدیر کے دن امرِ وصایت کو زندہ کرنا انبیاؑ کی سنت رہی ہے، جسے وہ ہمیشہ محترم رکھتے تھے۔

وصایت کا تسلسل: پیغمبر ادریسؑ سے پیغمبرِ خاتمؐ تک

حضرت آدمؑ کے دنیا سے جانے کے بعد، قابیلیوں کی طرف سے پیدا ہونے والی دھونس دھمکی اور طاقت کی وجہ سے حضرت شیثؑ کے زمانے سے امرِ وصایت مخفی ہو گیا اور وصایت کا اظہار ممکن نہ رہا۔ اس کے باوجود یہ سلسلہ اوصیائے مستخفین (پوشیدہ اوصیا) کی صورت میں جاری رہا، یہاں تک کہ حضرت ادریسؑ کا زمانہ آیا۔ حضرت ادریسؑ کی ولادت حضرت آدمؑ کی وفات کے دن ہی ہوئی تھی۔ حضرت ادریسؑ کے زمانے میں، ایک طویل مدت

---

(۱) "جس نے کسی شخص کو بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد پھیلایا ہو، قتل کیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا..." سورۂ مائدہ، آیت ۳۲

(۲) "اور جس نے کسی ایک شخص کو زندگی بخشی (اسے موت سے نجات دی) تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی بخشی..." (ایضاً)

(۳) "اگر اللہ کی حجت نہ ہوتی تو زمین اپنے اہل کو لے کر ختم ہو جاتی۔" اصول کافی، جلد ۱، صفحہ ۳۳۴

تک وصایت کے مخفی رہنے کے بعد، اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ اب امرِ وصایت، نبوت اور رسالت کو ظاہر کیا جائے۔

حضرت ادریسؑ کے بعد بھی وصایت کا یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ حضرت نوحؑ کا زمانہ آیا، جو پہلے اولوالعزم رسول ہیں۔ وصایت کے مقام میں تمام انبیا ایک درجے پر نہیں ہوتے؛ بعض اولوالعزم رسول ہوتے ہیں، بعض صرف رسول ہوتے ہیں، اور بعض نبی ہوتے ہیں۔ لہٰذا وصایت کے مختلف مراتب ہیں۔ کبھی ایک ہی زمانے میں کئی انبیا اور رسل موجود ہو سکتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک وصی ہوتا ہے اور باقی اسی وصی کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم خلیلؑ کے زمانے میں حضرت ابراہیمؑ وصی اور اولوالعزم رسول تھے، جبکہ حضرت لوطؑ حضرت ابراہیم خلیلؑ کے تابع تھے۔ یہ سنت اسی طرح جاری رہی اور مسلسل ایک رسول کے بعد دوسرے رسول آتے رہے: ﴿ثُمَّ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَىٰ﴾[1] اسی طرح وصایت کا یہ سلسلہ حضرت عیسیٰؑ تک پہنچا، اور پھر آخری نبی، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک جاری رہا۔

> **سنتِ نبی کشی اور وصی کشی بنی اسرائیل کا ایک تاریخی طریقہ اور روش رہی ہے۔ اگر ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ اوصیا اور اوصیائے اوصیا کو قتل کیا جاتا ہے، تو یہ اسی روش کا تسلسل ہے جو ان کی سرشت اور تاریخی کردار سے وابستہ ہے۔**

بنی اسرائیل کا انبیاؑ کے قتل میں تاریک کردار

ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنے عظیم انبیا کی بعثت کے ذریعے اپنے زمانے کی دوسری اقوام پر فضیلت عطا فرمائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بنی اسرائیل سب سے زیادہ بدبخت قوم بھی ثابت ہوئے؛ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبیوں کو قتل کرنا ان کا ایک معمول بن چکا تھا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ بنی اسرائیل ایک ہی دن میں تین سو انبیا کو قتل کر دیتے تھے۔ بعض روایات میں ذکر ہے کہ وہ صبح سے دوپہر تک ستر انبیا کو قتل کرتے اور پھر دوپہر کے وقت اپنی دکانیں کھول لیتے، گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لہٰذا انبیاء کا قتل اور اوصیاء کا قتل بنی اسرائیل کی ایک تاریخی روش اور سیرت بن گئی تھی۔ اگر آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اوصیاء اور ان کے جانشینوں کو قتل کیا جاتا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ اسی باطنی سرشت اور تاریخی روش کا تسلسل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے بارے میں سخت ترین مذمت فرمائی اور اسی جرم کی وجہ سے ان کے لیے ذلت اور محتاجی مقرر کی: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ... ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾[2] لفظ «يَقْتُلُونَ» عربی قواعد کے اعتبار سے فعلِ مضارع ہے؛ یعنی اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ قتل کوئی ایک مرتبہ کا واقعہ نہیں تھا، بلکہ مسلسل جاری رہنے والا عمل تھا اور ان کی عادت اور روش بن چکا تھا۔ اسی لیے جب رسولِ اکرم ﷺ پر قرآن کی آیات نازل ہوئیں اور یہودیوں کو ان لوگوں کے طور پر خطاب کیا گیا جو انبیا کے قاتل ہیں، تو انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ہم نے تو قتل نہیں کیا بلکہ ہمارے آباؤ اجداد نے کیا تھا؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ روش ان کے مزاج اور تاریخی کردار کا حصہ بن چکی تھی اور اگر موقع ملتا تو وہ بھی یہی عمل کرتے۔ یہودیوں نے حضرت یحییٰؑ اور حضرت زکریاؑ کو

---

(۱) "پھر ہم نے اپنے رسولوں کو پے در پے بھیجا۔" سورۂ مؤمنون، آیت ۴۴

(۲) « اور ان پر ذلت اور محتاجی کی مہر لگا دی گئی... یہ اس سبب سے تھا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ » سورۂ مبارکہ بقرہ، آیت ۶۱

نہایت دردناک طریقے سے شہید کیا۔ حتیٰ کہ ان کا یہ دعویٰ بھی نقل ہوا ہے کہ ہم نے حضرت عیسیٰ ؑ کو بھی قتل کیا ہے۔

اہل بیتؑ میں وصایت کا تسلسل اور تنہائی کے سخت ادوار

وصایت کی یہ سنت رسولِ اکرم ﷺ، روزِ غدیر اور امیر المؤمنین حضرت علی ؑ تک پہنچتی ہے۔ جب رسول اللہ ﷺ حضرت علی ؑ کی وصایت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس مسئلے کے خلاف ہونے والی منفی تشہیر اور پیدا کیے گئے نامناسب ماحول کی وجہ سے لوگ امیر المؤمنین علیہ السلام کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اسی لیے رسولِ اکرم ﷺ پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوتی ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾[1] رسول اللہ ﷺ لوگوں کے رویّوں کو دیکھتے ہوئے اس انتظار میں تھے کہ ایسا موقع فراہم ہو جس میں عوامی قبولیت اور آمادگی موجود ہو۔ جب آپ ﷺ نے وصایت کا اعلان فرمایا تو لوگوں نے اگرچہ بیعت کر لی، لیکن پیروی اور اطاعت کے میدان میں سب ایک جیسے نہ رہے۔

وصایت کا یہ سلسلہ رسولِ اکرم ﷺ اور امیر المؤمنین ؑ کی اولادِ طاہرین میں مسلسل جاری رہا۔ جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی تطہیر (خالص سازی) اور آزمائش، جسے اصطلاح میں «تمحیص» کہا جاتا ہے، مزید شدید ہوتی جاتی ہے۔ ہر مرتبہ جب کوئی امام منصب سنبھالتا ہے تو ممکن ہے کہ کچھ انحرافی راستے پیدا ہوں اور کچھ لوگ جدا ہو جائیں۔ ہم امام حسن ؑ اور امام حسین ؑ کے ادوار کو دیکھتے ہیں، پھر واقعۂ کربلا سے لے کر امام زین العابدین ؑ تک کا سلسلہ آتا ہے۔ امام زین العابدین ؑ کے بعد ایک گر وہ جدا ہو جاتا ہے اور آپ کی امامت کو قبول نہیں کرتا۔ پھر امام محمد باقر ؑ اور امام جعفر صادق ؑ کا دور آتا ہے۔ امام صادق ؑ کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اسماعیل کے حوالے سے ایک الگ گروہ وجود میں آتا ہے۔ اسماعیل، امام جعفر صادق ؑ کے بڑے بیٹے، ایک نہایت شریف، عظیم المر تبت اور پاکیزہ کردار انسان تھے۔ وہ امام صادق ؑ کی حیاتِ مبارکہ ہی میں وفات پا گئے۔ جب حضرت ؑ نے ان کی تجہیز و تدفین اور تشییعِ جنازہ انجام دی تو کئی مرتبہ اسماعیل کے جسدِ مبارک کو زمین پر رکھا، ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور کچھ لوگوں کو گواہ بنایا کہ دیکھو! وہ وفات پا چکے ہیں؛ تم گواہ رہو کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن جب حضرت ؑ نے انہیں دفن فرما دیا اور بعد میں امام صادق ؑ بھی دنیا سے رحلت فرما گئے تو کچھ لوگوں نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ اسماعیل زندہ ہیں، اور ہم اسماعیل کی پیروی کرتے ہیں۔ یہی لوگ بعد میں اسماعیلیہ کہلائے۔ امام موسیٰ کاظم ؑ کے بعد بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے امام کاظم ؑ کی امامت پر توقف کیا اور اسی وجہ سے وہ واقفیہ کہلائے۔ انہوں نے وصایت کے اس سلسلے اور اس الٰہی میراث کو آگے جاری نہ رکھا۔ امام رضا ؑ کی امامت کا مرحلہ اس قدر دشوار ہو گیا کہ چار سال تک آپ کی امامت کا اعلان عام نہیں کیا گیا۔ یعنی اختلافات بہت شدید تھے، لوگوں کی طرف سے قبول نہ کرنے کا مسئلہ بڑھ گیا تھا اور مخالفانہ فضا بہت غالب تھی۔ امام رضا ؑ کی امامت صرف چند خاص افراد کے لیے واضح تھی؛ یہاں تک کہ بعض ممتاز اصحاب بھی اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ پوشیدگی لوگوں کی عدمِ قابلیت کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ لوگوں کی اپنے امام کو پہچاننے کی صلاحیت کا فقدان اسی طرح جاری رہا، یہاں تک کہ امام جواد ؑ کا زمانہ آیا؛ جہاں وصایت کی سنت ایک کم عمر نوجوان کی

---

(۱) « اے رسول! جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے، اسے پہنچا دیجیے، اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا... » (سورۂ مبارکہ مائدہ، آیت ۶۷)

ذات میں ظاہر ہوئی۔ لوگوں کے لیے یہ بات بہت سخت اور دشوار تھی کہ ایک نوجوان بھی امام ہو سکتا ہے۔ یہ تمام مراحل دراصل اس عظیم مرحلے کے لیے تمہید تھے جو امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی وصایت کے ظہور سے متعلق تھے۔

عصرِ غیبت اور حاکمیت کا نیابتِ عامہ سے متصل ہونا

امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی ظاہری موجودگی کے اختتام کے بعد غیبت کا دور شروع ہوتا ہے۔ غیبتِ صغریٰ نے وصایت کی ایک نئی صورت کو ظاہر کیا۔ اس نوعیت کی وصایت رکھنے والے افراد معصوم نہیں تھے، لیکن وہ امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی جانب سے خصوصی نص کے ذریعے مقرر کردہ نوّابِ خاص تھے۔ یہ حضرات لوگوں اور حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے درمیان رابطے کے ذمہ دار تھے۔ یہ خود ایک عظیم آزمائش تھی کہ لوگ دیکھتے ہیں ایک ایسا شخص جو انہی میں سے ہے اور معصوم بھی نہیں، وہ امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا خاص نائب قرار پایا ہے۔ غیبتِ صغریٰ کے بعد غیبتِ کبریٰ اور نیابتِ عامہ کا دور شروع ہوا۔ وصایت کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک جاری رہتا ہے اور امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ حضرت امام نے امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی جانب سے وصی اور نائبِ عام کی حیثیت سے قیام کیا۔ پھر جس دن امام دنیا سے رخصت ہوئے، امرِ وصایت امام کے وصی، یعنی ہمارے شہید امام، کی طرف منتقل ہو گیا۔

اسلامی حاکمیت کی مشروعیت (شرعی طور پر جائز ہونا) کا تعلق امرِ وصایت سے ہے۔ نیابتِ عامہ میں بھی یہی اصول جاری ہے؛ ہر حکومتی تصرف، نائبِ امام کی اجازت سے وابستہ ہوتا ہے، اور اگر امام کا وصی اور نائب اس مقام پر موجود نہ ہو تو حاکمیتی تصرف میں مشکل پیش آتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، چونکہ امامِ معصوم علیہ السلام نے یہ اذن اپنے نائبِ عام کو عطا فرمایا ہے، اسی لیے اس حاکمیت کے تصرفات قابلِ قبول قرار پاتے ہیں۔ غور کیجیے کہ یہ کتنی خوبصورت حقیقت ہے کہ اس حاکمیت میں ہمارا ہر عمل الٰہی امر سے منسوب ہوتا ہے؛ جبکہ اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو یہی امر صرف ایک انسانی امر بن کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ وصایت کے اس امر کو، جو ہماری حاکمیت کو الٰہی بناتا ہے اور ہمارے تصرفات کو خدا کے حکم سے وابستہ کرتا ہے، ہمارے لیے محفوظ رکھے اور ہمیں بھی اس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ کیونکہ ہر تصرف اگر خدا کے حکم کے مطابق ہو، تو اگرچہ وہ میرے اختیار اور میرے ارادے سے انجام پائے، لیکن اس کی حقیقت زمین و آسمان کے فرق کے برابر مختلف ہوتی ہے۔

> **وصایت کا یہ سلسلہ رسولِ اکرم ﷺ اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی اولادِ طاہرین سے مسلسل وابستہ ہے۔ جوں جوں یہ سلسلۂ وصایت آگے بڑھتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی تطہیر و آزمائش، جسے اصطلاح میں «تمحیص» کہا جاتا ہے، مزید سخت اور شدید ہوتی جاتی ہے۔**

خلاصہ یہ کہ امرِ وصایت حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور خاتم الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک پہنچا، پھر اوصیا علیہم السلام کے بعد نیابتِ عامہ کے ذریعے جاری رہا۔ ہمیں فخر ہے کہ ہم ایسے دور میں زندگی گزار رہے ہیں جہاں الٰہی حاکمیت امام زمان عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی وصایت اور نیابتِ عامہ کے ذریعے قائم ہے۔ ان شاء اللہ ہمیں بھی اپنے ولیِ الٰہی اور نائبِ امام زمان کی اطاعت و پیروی میں روز افزوں توفیقات حاصل ہوں۔

یہود، نبوت اور وصایت کے قاتل

یہود اور بنی اسرائیل کا طریقہ یہ تھا کہ وہ انبیا کی پیروی کرنا چاہتے تھے، لیکن ایسے نبی کی جو ان کی خواہشات اور پسند کے مطابق ہو؛

نہ کہ وہ نبی جو خدا کا حکم اور پیغام بیان کرے۔ اسی لیے چونکہ وہ خود ظالموں کے دائرے میں شامل تھے، ان انبیا کے مقابلے میں کھڑے ہوجاتے تھے جو خدا کی طرف سے ظلم کے خلاف قیام کرتے تھے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایران میں ایک دینی رہنما کا ہونا کوئی مسئلہ نہیں، لیکن وہ رہنما ایسا ہونا چاہیے جسے ہم پسند کریں اور جو ہماری خواہشات کے مطابق ہو۔ غور کریں کہ یہ دراصل انہی کی فکر اور فطرت ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل انبیا کے قاتل رہے ہیں؛ یہ ان کی تاریخی سرشت ہے۔

آسمانی والدین

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴾ (نمل:۱۹)

"اور اس نے کہا: اے میرے پروردگار! مجھے الہام عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر عطا فرمائی ہے اور ایسا نیک عمل انجام دوں جسے تو پسند فرمائے، اور اپنی رحمت کے ذریعے مجھے اپنے صالح بندوں میں شامل فرما۔"

اس آیتِ کریمہ ﴿أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ﴾ میں «والدین» سے مراد صرف جسمانی والدین نہیں، بلکہ اس کے اعلیٰ تر مصادیق، جیسے رسولِ اکرم ﷺ اور ائمۂ اطہار علیہم السلام بھی شامل ہیں۔ ان عظیم نعمتوں کا شکر محض ایک اخلاقی فریضہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایات کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔

ہمارے ساتھ امام کا تعلق باپ کا سا تعلق ہے۔ جب رسولِ خدا ﷺ اور امیر المؤمنین علیہ السلام کو اس امت کے باپ قرار دیا گیا ہے تو یہ ان کی شفقت اور رحمت کے پہلو کو ظاہر کرتا ہے؛ کیونکہ وہ ہماری تمام باریکیوں اور مصلحتوں کو اس سے کہیں زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں جتنی ہماری عقل ان کا ادراک کر سکتی ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہو کہ ہم کن عظیم ہستیوں کے ساتھ وابستہ ہیں، تو ہم نہ صرف ان کے وجودِ مبارک پر شکر ادا کریں گے بلکہ ان نعمتوں پر بھی شکر بجالائیں گے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائی ہیں۔

مثال کے طور پر، جب ہمیں معلوم ہے کہ رسولِ خدا ﷺ اور امیر المؤمنین علیہ السلام حضرت فاطمۂ زہرا علیہا السلام کی ولادت پر کس قدر خوش ہوئے تھے، تو اگر ہم حقیقتاً ان کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، ہمیں بھی اسی قدر خوش ہونا چاہیے اور بارگاہِ الٰہی میں شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمارے نبی کو ایسا گراں قدر گوہر عطا فرمایا۔

انتخاب کی روداد



آیت اللہ عباس کعبی

انٹرویو

انقلابِ اسلامی کی قیادت کے لیے آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے انتخاب کی روداد
آیت اللہ عباس کعبی (مجلسِ خبرگانِ رہبری کی مجلسِ عاملہ کے رکن) سے گفتگو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عظیم الشان قائد، امام خامنہ ای ؒ کی شہادت پر تعزیت پیش کرتا ہوں۔ جس طرح سید الشہداء امام حسین ؑ کی شہادت نے اسلام کو باقی اور زندہ رکھا، اسی طرح امت کے عظیم قائد امام خامنہ ای ؒ کی شہادت نے انقلابِ اسلامی کے دوام اور بقا کی ضمانت فراہم کی۔ حقیقتاً خون تلوار پر غالب آتا ہے؛ یہی کربلا کا درس ہے۔ اس عظیم امام کی شہادت کی ابتدائی برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ خداوندِ تبارک و تعالیٰ نے امام زمانہ ؑ کے لطف و عنایت کے سائے میں، میدان میں موجود مؤمن، انقلابی اور حسینی ملت کے دلوں کو ان کے شایستہ اور صالح جانشین کی طرف متوجہ فرمایا۔ ملت کے امین افراد، عادل، بصیر اور انقلابی خبرگان کے دل، موحدین کے مولا کی ضربت کی رات، اور شبِ قدر؛ یعنی تقدیر کی رات، سرنوشت کی رات، فرشتوں کے نزول کی رات، صاحبِ امر کی خدمت میں تقدیرات پیش ہونے والی اس عظیم رات میں حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای مدظلہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ اسی رات مجلسِ خبرگان کے منتخب کردہ فرد کے طور پر آپ کو ملت اور امت کے سامنے متعارف کرایا گیا۔ اسی شبِ قدر میں، قرآن سے توسل، چہاردہ معصومین ؑ سے توسل اور قرآن کو سر پر رکھ کر دعاؤں کے ساتھ، ملت نے فوراً بیعت کی۔ اور بتدریج ملت کے مختلف طبقات، حوزہ اور یونیورسٹی کے اہلِ علم، احزاب، گروہوں اور مختلف سیاسی و سماجی جریانوں نے عظیم امام کے انقلاب، اسلام کے بلند مرتبہ شہدا اور ان کے مقدس راستے کے ساتھ تجدیدِ عہد کیا، اور اسلامی انقلاب کے تیسرے رہبرِ عزیز کے ساتھ بیعت کی۔

ابتدائی لمحات

عظیم الشان امام کی شہادت کی خبر پہنچتے ہی، مجلسِ خبرگان کی مجلسِ عاملہ نے اتوار کی صبح آٹھ بجے اجلاس منعقد کیا اور مشاورت کا آغاز ہوگیا۔ اس عظیم فیصلے کا قانونی اور شرعی طریقۂ کار آئینِ اسلامی جمہوریہ ایران اور مجلس کے ضابطۂ کار کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا، اور مجلسِ عاملہ مسلسل اجلاس منعقد کرتی رہی۔ میں شرعی گواہی دیتا ہوں کہ ہم نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا، بلکہ مسلسل خبرگان کے اراکین دو، تین، چار، پانچ، دس، پندرہ اور بیس افراد کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ مشورے کرتے رہے۔

تین رکنی کمیٹی

ہمارے پاس آئین کی شق ۱۰۷ اور ۱۹۰ کی بنیاد پر ایک کمیٹی موجود تھی جسے تین رکنی کمیٹی کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی میں مرحوم آیت اللہ امینی، مرحوم آیت اللہ یزدی، مرحوم آیت اللہ مؤمن، مرحوم آیت اللہ طاہری خرم آبادی اور دیگر بزرگ علماء شامل تھے۔ یہ کمیٹی ان شخصیات کا جائزہ لیتی تھی جو اس عرصے میں قیادت کے لیے موزوں سمجھی جاتی تھیں اور ان کے لیے باقاعدہ فائلیں تشکیل دی جاتی تھیں۔ مجموعی طور پر ۱۹۹۸ء سے ۲۰۲۵ء تک ہمارے پاس آٹھ تین رکنی کمیٹیاں رہیں، اور ان کمیٹیوں میں ۲۳ سے زیادہ افراد کا جائزہ لیا گیا۔ اس سلسلے میں سینکڑوں، بلکہ اگر ہزاروں صفحات نہ کہیں، تو بہت بڑی مقدار میں دستاویزات تیار کی گئیں۔ ہر شخصیت کی فائل الگ الگ زیرِ بحث لائی گئی، اس پر تحقیق اور غور و خوض کیا گیا، اور یہ سابقہ ریکارڈ مجلسِ عاملہ اور مجلسِ خبرگان دونوں کے پیشِ نظر رہا۔

ہم نے خبرگان کی مختلف کمیٹیوں میں بھی جائزہ لیا۔ رہبرِ معظم انقلاب کی جانب سے کسی خاص فرد کے بارے میں کوئی واضح سفارش موجود نہیں تھی، بلکہ آپ ہمارے سامنے زیادہ تر معیار اور خصوصیات بیان کرتے تھے۔ مجلسِ خبرگان کی تحقیقاتی کمیٹی میں، جب ہم چند مرتبہ حضرت آقا کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے خاص طور پر مالی تقویٰ، امریکہ دشمنی، صہیونیت دشمنی، اور انقلاب کے بنیادی اصولوں پر گہری عقیدت پر زور دیا۔ ان تمام امور کو مدِ نظر رکھا گیا۔ اسی طرح عمومی مقبولیت، عوام میں اثر ورسوخ اور کلمہ کی تاثیر کو بھی اہمیت دی گئی۔

انتخاب کا عمل

ہم نے دو طریقۂ کار طے کیے تھے:

۱۔ تحریری ووٹنگ اور غیر حضوری طریقۂ کار: کیونکہ جنگ کے خطرناک حالات اور دشمن کی جانب سے براہِ راست خطرات موجود تھے۔

۲۔ حضوری اجلاس کا انعقاد: ہم نے کہا کہ اگر ممکن ہوا تو حضوری اجلاس منعقد کر کے اسی اجلاس میں یہ فیصلہ کیا جائے گا، اور اگر ایسا ممکن نہ ہو سکا تو ضابطۂ کار میں کی گئی ترمیم کے مطابق غیر حضوری طریقۂ کار اور تحریری رائے شماری کے ذریعے عمل کو آگے بڑھایا جائے گا۔ ہم نے دونوں طریقۂ کار کا آغاز کر دیا تھا اور مشاورت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ملک کے بعض قانونی ادارے اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ مجلسِ خبرگان کا حضوری اجلاس ضرور منعقد ہو، تاکہ یہ واقعہ تاریخی ریکارڈ کا حصہ بن سکے۔ یہ نقطۂ نظر بھی ہمارے لیے قابلِ توجہ تھا، لیکن ہمیں یہ تشویش تھی کہ شاید حضوری اجلاس ممکن نہ ہو سکے؛ اسی لیے ہم نے دونوں راستے بیک وقت اختیار کیے۔ اس معاملے میں مشاورت بھی ہوئی اور ان تمام ممکنہ انتخاب کے طریقوں کے بارے میں گفتگو کی گئی جن پر غور کیا جا سکتا تھا۔ مجلسِ خبرگان کے اراکین نے مکمل آزادی کے ساتھ، ماہرین کی رائے، اپنی شرعی ذمہ داری اور تین رکنی کمیٹی کی تحقیقات و رپورٹس کے علاوہ، خود بھی وسیع تحقیقات کیں، سوالات کیے اور جوابات حاصل کیے۔ مجلسِ خبرگان کے معزز اراکین نے تمام پہلوؤں سے بحث، گفتگو، اختلافِ نظر اور غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ ایک فیصلے تک پہنچ گئے۔ تقریباً تاریخی اجلاس سے پہلے ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر مجلسِ خبرگان کا اجلاس منعقد ہوا تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔

وہ تاریخی اجلاس

کئی مرتبہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجلس کا علنی اجلاس منعقد کیا جائے، لیکن امن و عامہ کی صورتحال کی وجہ سے وہ اجلاس ملتوی ہو گئے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس رات اجلاس منعقد ہوا، اس بات کا امکان کہ ہم اجلاس منعقد کر سکیں گے یا نہیں، پچاس پچاس تھا۔ کیونکہ ایک طرف دشمن نے خبرگان کے دفتر کو نشانہ بنایا تھا، جس میں خبرگان کے بعض ملازمین اور حفاظتی اہلکار شہید ہو گئے تھے، اور اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خبرگان کے مرکزی دفتر کی پرانی عمارت کو بھی نشانہ بنایا تھا، اور براہِ راست دھمکیاں بھی دے رہا تھا کہ ہم اجلاس منعقد نہیں ہونے دیں گے۔

لیکن خبرگان کے اراکین پُرعزم تھے، اور الحمدللہ اجلاس ایک ایسے ماحول میں منعقد ہوا جو روحانیت، اخلاص، اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم ارواحنا فداہ سے توسل سے سرشار تھا۔ حقیقتاً اگر میں اس تاریخی رات کی کیفیت بیان کرنا چاہوں تو کہنا ہوگا کہ اس رات کا حاکم ماحول ایک توحیدی ماحول تھا؛ امام زمانہ ارواحنا فداہ سے توسل کا ماحول تھا؛ اور شرعی ذمہ داری پر عمل کرنے کا ماحول تھا۔ اس اجلاس میں تمام پہلوؤں پر مشتمل جامع گفتگوئیں ہوئیں، اور آخر کار ووٹنگ کے پرچے تقسیم کیے گئے۔ خبرگان کے سامنے موجود امیدواروں کے بارے میں مکمل آزادی کے ساتھ رائے شماری ہوئی اور اراکینِ خبرگان نے اپنے خفیہ ووٹ ڈالے۔

خبرگان کا فیصلہ دوٹوک اور مضبوط فیصلہ تھا۔ مجھے کہنا چاہیے کہ اجلاس میں موجود ۹۰ فیصد سے زیادہ اراکین نے حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای مدظلہ کی ولایت کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ فیصلہ تکبیر، شکر، حمد اور اللہ تعالیٰ کی سپاس گزاری کے ساتھ مکمل ہوا۔ خبرگان کے اراکین نے وہیں عہد کیا کہ جس طرح انہوں نے ولی فقیہ کی تشخیص میں اخلاص کے ساتھ اپنا فریضہ انجام دیا ہے، اسی طرح ولی فقیہ کی حمایت اور وفاداری کے میدان میں بھی پوری قوت کے ساتھ کھڑے رہیں گے۔ اسی موقع پر انہوں نے بیعت بھی کی۔ شاید یہ کہنا درست ہو کہ اکثریت نے نمازِ شکر بھی ادا کی اور اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ جس لمحے یہ خبر عام ہوئی، اسی وقت شکرگزاری اور حمدِ الٰہی کی ایک لہر پیدا ہوئی اور بالآخر عمومی اور قومی سطح پر بیعت کا اظہار سامنے آیا۔

مجلس کے حاضر اراکین میں سے ۹۰ فیصد سے زیادہ نے حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای مدظلہ کی ولایت اور رہبری کے حق میں ووٹ دیا۔

میں ملتِ عظیم ایران کو بشارت دینا چاہتا ہوں کہ اسلامی انقلاب کے دوسرے مرحلے (گام دوم) کے امام کی امامت کا دور، ہمارے شہید امام کی حکمرانی کی فکری و عملی تشکیل کو نافذ کرنے اور کشادگیوں کا دور ہوگا۔ یہ دور حکمرانی میں تبدیلی، مؤمن، انقلابی، باصلاحیت، دانا اور توانا قوتوں کے میدان میں آنے کا دور ہوگا۔ یہ دور نوجوانوں کی روشن صلاحیتوں اور عظیم قومی ظرفیتوں کو مختلف میدانوں میں عملی شکل دینے کا دور ہوگا۔

ہم اللہ تعالیٰ کا بے شمار نعمتوں پر شکر ادا کرتے ہیں، خصوصاً اس نعمت پر کہ اس نے شبِ قدر میں خبرگان کے دلوں کو اس عظیم تاریخی انتخاب کی طرف رہنمائی عطا فرمائی۔

انقلاب کے تیسرے عزیز رہبر کا عہد، امت اور امامت کے عظیم پیوند کا عہد ہوگا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس گامِ دوم کے امام کی خدمت اور سربازی کی توفیق عطا فرمائے، جس طرح اس نے ہمیں اپنے شہید امام کی پیروی کا شرف عطا فرمایا۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

لہ ملکۃ الاجتہاد

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے علمی مقام اور اجتہاد کی گواہی: فقہائے حوزہ علمیہ



آیت اللہ سید محمد علی موسوی جزائری

مجلس خبرگانِ رہبری کے رکن، حوزہ علمیہ خوزستان کے سربراہ اور خارجِ فقہ واصول کے استاد

یقیناً حضرت علامہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای فقہ واصول کے عظیم اساتذہ میں سے ہیں، اور سیکڑوں اہلِ فضل وعلم نے ان کے درس میں شرکت کی ہے۔ میں نے بعض علمی اور فقہی مسائل میں ان کے ساتھ بحث ومباحثہ کیا ہے اور انہیں صاحبِ نظر اور ملکۂ اجتہاد رکھنے والا پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں محفوظ رکھے، انہوں نے علم اور عدالت (یعنی اعلیٰ ترین درجۂ تقویٰ) کو اپنے اندر جمع کیا ہے[1]۔

---

(۱) مذکورہ متن ایک خط کا ترجمہ ہے جو آیت اللہ سید محمد علی موسوی جزائری نے کویت کے ایک عالم دین حجت الاسلام والمسلمین حسین معتوق کے خط کے جواب میں رہبر انقلاب کے مقام اجتہاد کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے:

بسمہ تعالیٰ

سماحۃ حجۃ الإسلام والمسلمین الشیخ حسین المعتوق دام تأییدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

شیخنا الجلیل الامر کما تفضلتم فإن سماحۃ الحجۃ العلامۃ السید مجتبی الحسینی الخامنہ ای من کبار الأساتید فی دروس الفقہ والأصول وقد حضر درسہ مئات من الأفاضل وقد باحثت معہ فی بعض المسائل فوجدتہ من اھل النظر واصحاب ملکۃ الإجتہاد وقد جامع حفظہ اللہ تعالیٰ بین العلم والعدالۃ فی المرتبۃ العلیا من التقوی، فحفظہ اللہ ورعاہ ونفع المسلمین بطول بقائہ.

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

العبد السید محمد علی الموسوی الجزائری

۲ رمضان ۱۴۰۲ الهجری القمری»



آیت اللہ علی عندلیبی

جامعۂ مدرسینِ حوزہ علمیہ قم کے رکن اور حوزہ علمیہ کے دروسِ خارج کے استاد

یہ گواہی دی جاتی ہے کہ حضرت آیت اللہ جناب حاج سید مجتبیٰ خامنہ ای مدظلہ العالی، ملکۂ اجتہاد کے حامل، مسائل کے فہم میں قوی استعداد اور غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں۔ کتاب « طہارت و نجاستِ خمر »، جو معظم لہ کے درس کی تقریر ہے، مذکورہ بالا امور کے اثبات کے لیے ایک نمونہ ہے۔[1]



آیت اللہ محمد مہدی شب زندہ دار

دبیر شورائے عالی حوزہ ہائے علمیہ، جامعۂ مدرسینِ حوزہ علمیہ قم کے رکن، فقہائے شورائے نگہبان میں سے اور حوزہ علمیہ کے دروسِ خارج کے استاد

علمی اعتبار سے یہ کہنا چاہیے کہ اس سلسلے میں کوئی شک نہیں کہ بحمد للہ وہ اس عنوان کے حامل ہیں جو مقبولۂ عمر بن حنظلہ[2] میں وارد ہوا ہے، جہاں فرمایا گیا ہے: « جو شخص ہمارے حلال و حرام میں غور کرے اور ہمارے احکام کو پہچانے، ہم نے اسے تم پر حاکم قرار دیا ہے۔ »[3] اس مبارک روایت میں معیار یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ عالم اسلام اور اہلِ بیت کے حلال و حرام میں غور و نظر کرے اور احکامِ الٰہی سے معرفت رکھتا ہو۔ یہی وہ معیار ہے جس کی بنیاد پر حضرت نے فرمایا: « پس میں نے اسے تم پر حاکم قرار دیا ہے۔ » اس اعتبار سے اس امر میں کوئی شک نہیں کہ آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای اس مرتبے کے حامل ہیں۔[4]

---

(۱) یہ عبارت ان کے ہاتھ سے تحریر شدہ گواہی کا متن ہے، جو آیت اللہ خامنہ ای کے درسِ خارجِ فقہ کی تقریرات کا جائزہ لینے کے بعد تحریر کی گئی۔

(۲) چونکہ یہ روایت فقہاء کے نزدیک قابلِ قبول قرار پائی ہے، اس لیے اسے مقبولہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ « عمر بن حنظلہ » اس روایت کے راوی ہیں، جنہوں نے اسے براہِ راست امام صادق علیہ السلام سے سنا ہے۔

(۳) الکافی، جلد ۱، صفحہ ۶۷۔

(۴) ۳۔ مستندِ حدیثِ گمنامی۔



آیت اللہ احمد عابدی

حوزہ علمیہ کے دروسِ خارج کے استاد

«وَأَمَّا مَنْ كَانَ مِنَ الْفُقَهَاءِ...» ؛فقیہ ہونا، قوۂ عاقلۂ نظری کے کمال کا نام ہے، اور یہ کمال حاج آقا مجتبیٰ میں بہترین صورت میں موجود ہے۔ ان کے درس میں اتنے عالم، دانشمند اور سیکڑوں ایسے فضلا طلبہ حاضر ہوتے تھے جو درسِ خارج پڑھ رہے ہوتے تھے؛ یہ خود ان کی فقاہت کی علامت ہے۔

انقلاب کے آغاز ہی سے ملک میں امن وعامہ، مخبری اور حفاظتی امور سے متعلق بہت سے مسائل پیش آتے تھے؛ مثلاً زندان، تعزیرات، جاسوسی، تعاقب، نگرانی اور اس نوعیت کے دیگر مسائل سے متعلق شرعی مسائل۔ امام ﷺ نے ان مسائل کے جوابات دینے کی ذمہ داری آیت اللہ مشکینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے سپرد کی تھی۔ اس بات کے مدِ نظر کہ سابق علما اور گزشتہ مراجعِ عظام کو اس نوعیت کے مسائل کا سامنا نہیں ہوا تھا، کیونکہ شیعہ عموماً حکومت کے منصب پر فائز نہیں رہے تھے، اس لیے ان میں سے بہت سے مسائل کے جوابات آیت اللہ مشکینی کی جانب سے بھی نہیں دیے گئے۔ لیکن اس کے بعد اس نوعیت کے مسائل کا جواب دینے کی ذمہ داری جس شخصیت نے سنبھالی، وہ حضرت آیت اللہ حاج آقا مجتبیٰ حسینی خامنہ ای تھے۔

اولاً، امن وعامہ اور حفاظتی امور ایسے مسائل ہیں جنہیں مراجعِ عظمِ تقلید کی طرف رجوع نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ یہ مسائل حکومت سے متعلق تھے۔ ثانیاً، اس نوعیت کے مسائل جدید اور مستحدث مسائل ہیں اور ان کے لیے ضروری ہے کہ جواب دینے والا شخص خود موضوع کو مکمل طور پر جانتا ہو، تاکہ وہ درست شرعی حکم بیان کرسکے۔ مثال کے طور پر جنگ سے متعلق مسائل، جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں کی نوعیت، دفاع کی مختلف صورتیں اور اسی طرح کے دیگر امور؛ جو شخص ان شعبوں سے متعلق مسائل کا جواب دینا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود ان موضوعات سے دقیق طور پر واقف ہو۔ اس صلاحیت کے حامل، ملک کے رازوں کے امین اور محرمِ اسرار ہونے کے ساتھ ساتھ موضوعات پر مکمل دسترس رکھنے والے، فقہ واصول اور معارفِ دینی سے بھی پوری طرح آشنا شخص حاج آقا مجتبیٰ تھے۔ ملک کے وہ تمام ادارے اور تنظیمیں جو اس نوعیت کے امور سے متعلق ذمہ داریاں انجام دے رہی تھیں، خود ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے ان مسائل کے احکام ومعارف حاصل کرتے تھے۔



آیت اللہ غلام علی صفائی بوشہری

مجلسِ خبرگانِ رہبری کے رکن، حوزہ علمیہ کے دروسِ خارج کے استاد

فقہ کے مختلف مدارس و مکاتب، یعنی مکتبِ بغداد، مکتبِ حلہ، مکتبِ نجف، مکتبِ سامرہ، مکتبِ کربلا، مکتبِ جبلِ عامل اور مکتبِ قم میں کسی فرد کی علمی صلاحیت اور اجتہاد کی اہلیت کے تعین کے لیے مخصوص معیارات موجود رہے ہیں۔ یہ کبھی تحریری صورت میں ہوتے تھے؛ یعنی کسی مسلم الثبوت اور معروف مجتہد کی جانب سے کسی فرد کے لیے حکمِ اجتہاد تحریر کیا جاتا تھا۔ کبھی اجتہاد کی گواہی زبانی اور شفاہی طور پر دی جاتی تھی، کبھی درسِ خارج کی اجازت کے ذریعے اس کے اجتہاد کا اظہار ہوتا تھا، اور کبھی حوزہ علمیہ میں کسی فرد کے اجتہاد کا رواج، شہرت اور معروفیت ہی اس کے اجتہاد کے تعیّن کا ذریعہ بنتی تھی۔

اس سے مراد یہ ہے کہ کثیر تعداد میں فضلا اور طلبہ کسی بزرگ عالم کے درس میں شرکت کرتے اور ان کے زیرِ تعلیم رہتے۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب وہ بزرگ برسوں تک درس دیتے رہے ہوں، ان کے ہم عصر دیگر بزرگ علما بھی تدریس میں مصروف ہوں، اور طلبہ خود اس بزرگ کے درس کو پسند کرتے اور ان کے علمی درس کی گہرائی اور پختگی کی تائید کرتے ہوں۔ لہٰذا فضلا اور علما کے درمیان اس عالم کے فضل و علمی مقام کی شہرت اور رواج کے ذریعے اس کا اجتہاد عملاً ثابت اور متعیّن ہو جاتا تھا۔

حضرت آیت اللہ آقا سید مجتبیٰ خامنہ ای کا اجتہاد ثابت اور محرز ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک طویل عرصے تک قم میں، جو ایران بلکہ عالمِ تشیع کا فقہی مرکز ہے، درسِ خارج تدریس فرمایا، اور بہت سے فضلا ان کے درس میں شرکت کرتے تھے۔ وہی افراد جو دوسرے بزرگ علما اور مراجع کے درس میں شرکت کرتے تھے، ان کے درس میں بھی حاضر ہوتے، ان کی علمی صلاحیت کی تائید کرتے اور اس طرح ان کا اجتہاد حوزہ علمیہ میں علمی شہرت اور رواج کے ذریعے متعیّن اور ثابت ہو چکا ہے۔

دوسری جانب، بہت سے علماء اور ایسے بزرگ اہلِ علم، جن کی اس میدان میں معتبر رائے اور علمی حیثیت ہے، نے ان کی علمی توانائی اور علمی گہرائی کا اعتراف کیا ہے؛ خواہ وہ ان کے اساتذہ ہوں یا وہ بزرگ علما جو اس موضوع میں صاحبِ نظر ہیں۔

مجلسِ خبرگان میں بھی قاطع اکثریت ان کے اجتہاد کی قائل ہے۔ مجلسِ خبرگان کے معزز نمائندگان بھی ایسے فقہا ہیں جو اجتہاد کی تشخیص کے معاملے میں صاحبِ نظر اور صاحبِ رائے ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور دلیل بعض مراجعِ عظام کی وہ تائیدات ہیں جن میں انہوں نے صراحت کی ہے کہ قیادت کے لیے موزوں ترین افراد میں حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای سرفہرست ہیں۔ یہ امر بھی اس بات کا مؤید ہے کہ وہ تمام ابوابِ فقہ میں اعلیٰ درجے کے افتا کی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہیں؛ کیونکہ یہ قیادت کی بنیادی ضروریات میں سے ہے۔

ایک اور اہم نکتہ ان کے درسِ خارج کی تحریری تقریرات ہیں، جو منابع کے استقرا، تحقیق و تدقیق اور دلائل سے نہایت دقیق استنباط میں ان کی گہری نظر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ رہبرِ معظم نے اپنے بزرگوار فرزند، ہمارے عزیز رہبر، سے فرمایا تھا کہ آپ «العروۃ»[1] پر حاشیہ تحریر کریں۔ یہ اس بات کی تائید ہے کہ رہبرِ معظم بھی اس بزرگوار کے اجتہاد کی تصریح اور تائید فرماتے ہیں۔

اسی بنا پر مختلف ابواب میں افتا کی علمی صلاحیت، خواہ وہ مستحدث مسائل ہوں یا غیر مستحدث، ان کے بارے میں پوری طرح ثابت اور محرز ہے۔ وہ صرف فقہی مبانی اور باریک نکات پر مکمل دسترس نہیں رکھتے، بلکہ فقہی ڈھانچے اور بہت سے فقہی امور میں تحول کے میدان میں صاحبِ نظریہ بھی ہیں؛ اور یہ اس میدان میں ان کی غیر معمولی علمی توانائی اور صلاحیت کی علامت ہے۔

اسی لیے اجتہاد اور افتا کی صلاحیت کو جانچنے اور ثابت کرنے کا وہ نظام، جو فقہ کے تمام مدارس و مکاتب میں مذکورہ مختلف طریقوں سے رائج رہا ہے، حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای، رہبرِ بزرگوار، کے بارے میں بھی موجود ہے اور ان کی علمی صلاحیت اس اعتبار سے محرز اور ثابت ہے۔[2]



آیت اللہ علی اکبر رشاد

صوبۂ تہران کے حوزہ ہائے علمیہ کی شورائے عالی کے صدر، پژوھشگاہِ ثقافت و اندیشۂ اسلامی کے سربراہ، اور حوزہ علمیہ کے دروسِ خارج کے اساتذہ میں سے

میں ان اوصاف و احوال میں سے چند باتیں، جن سے یہ عاجزِ کمترین گزشتہ کئی برسوں کے دوران ان کی رفاقت اور شناسائی کے سبب واقف ہوا ہوں، اختصار کے ساتھ بیان کرتا ہوں:

وہ ایک ممتاز مجتہد ہیں، استنباط کے اصول و مبانی پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور ایک پُر رونق درسِ خارج کے حامل ہیں، جہاں کئی برسوں سے حوزہ علمیہ قم کے بڑی تعداد میں ممتاز اور باصلاحیت فضلاء، اللہ تعالیٰ اسے حوادثِ زمانہ سے محفوظ رکھے، ان کے فیض بخش درس سے استفادہ کرتے آرہے ہیں۔

وہ بھی اپنے بزرگوار والد کی مانند غیر معمولی استعداد اور بے مثال ذہانت، تیز فہمی اور قوتِ ادراک، بیدار اور تنقیدی ذہن، نیز گہری بصیرت اور عمیق فکری نگاہ کے حامل ہیں۔[3]

---

(۱) کتاب «العروۃ الوثقیٰ» پر حاشیہ نویسی حوزہ ہائے علمیہ کی ایک معروف اور رائج علمی روایت ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی عالم مؤلفِ کتاب کے بیان کردہ مسائل اور ان میں ذکر کردہ فروع کے ذیل میں اپنی رائے درج کرتا ہے۔ یہ کام عموماً وہی حضرات انجام دیتے ہیں جو علمی اعتبار سے اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوں اور اصطلاحاً درجۂ اجتہاد تک پہنچ چکے ہوں۔

(۲) یہ متن انقلاب کے عزیز رہبر کے اوصاف کے بارے میں ان کے ویڈیو پیغام میں بیان کیے گئے مطالب کی تدوین و ویرایش شدہ صورت ہے۔

(۳) یہ عبارت انقلاب کے عزیز رہبر کے انتخاب کے موقع پر ان کے پیغام کے ایک حصے سے ماخوذ ہے۔

ان کی مرجعیت صرفِ ایران تک محدود نہیں ہے

حجت الاسلام علی اشرف مؤیدی

انٹرویو



رہبرِ معظم انقلاب کے انتخاب کی الٰہی روداد، حجۃ الاسلام والمسلمین علی اشرف مؤیدی (حوزہ علمیہ قم کے اساتذۂ اخلاق میں سے)

خط: رہبرِ معظم، حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای سے آپ کی کتنی شناسائی اور واقفیت ہے؟

میری ان سے زیادہ آمد و رفت اور بالمشافہ ملاقاتیں تو نہیں رہیں، اگرچہ دل میں ان سے ایک غیبی عقیدت و محبت ضرور تھی؛ کیونکہ میں ان کی خصوصیات اور اوصاف کے بارے میں سنتا رہتا تھا۔ حقیقتاً اور انصاف کی رو سے دیکھا جائے تو ان کا انتخاب سو فیصد الٰہی تھا۔

خط: کیا آپ انتخاب کے الٰہی ہونے کی نشانیاں بیان فرمائیں گے؟

مقامِ معظمِ رہبری کی شہادت سے پہلے عمومی صورتِ حال کیا تھی؟ ہمیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ آقا نے اپنی عمر گزار لی ہے اور اگر کل وہ ہمارے درمیان سے چلے جائیں اور یہ ستون گر جائے تو حالات کس طرف جائیں گے؟ آپ نے خود دیکھا کہ اندرونی اور بیرونی حالات کس طرح کے تھے؛ کیا کوئی ایسا شخص موجود ہے جس پر سب کا اتفاقِ رائے ہو، اور سب متحد و یکجا ہو کر اسے اپنا رہبر منتخب کر لیں؟

لیکن آقا کی شہادت کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام دلوں کو بدل کر رکھ دیا اور انہیں الٰہی رنگ عطا کر دیا۔ بالکل انقلاب کے ابتدائی دنوں کی طرح، ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ لوگ رہبر کے انتخاب کے لیے بے تاب تھے۔ بالخصوص جب حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای منتخب ہوئے تو ایسا محسوس ہوا جیسے سب انہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے ذریعے ہوا۔ انسان دیکھتا ہے کہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے لوگ، الحمدللہ، متحد و یک جان ہو گئے، اور مجلسِ خبرگانِ رہبری کا بھی یہی حال تھا۔ انسان محسوس کرتا تھا کہ خود خبرگانِ رہبری بھی، بالخصوص اس وجہ سے کہ دشمن انہیں ایک جگہ جمع نہیں ہونے دے رہا تھا، حیران و سرگرداں تھے اور نہیں سمجھ آ رہی تھی کہ کیا کریں؛ لیکن جب وہ کامیاب ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے پاکیزہ ذہنوں اور دلوں کو آقا سید مجتبیٰ کے انتخاب کی طرف رہنمائی فرمائی۔ انسان واضح طور پر محسوس کرتا ہے کہ یہ انتخاب سب کے دلوں میں اتر گیا۔ ہر انسان کی الٰہی فطرت، اس

پیاسے کی مانند جو صاف و شفاف پانی کا طلب گار ہو، اس انتخاب کے ذریعے سیراب ہوگئی۔ یقیناً جس لمحے سے وہ منتخب ہوئے ہیں، وہ امامِ عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی خصوصی عنایت کے سائے میں ہیں۔ ان کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ «یَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ» ہیں۔ اللہ تعالیٰ بحقِ جدہ حضرت فاطمۂ زہرا علیہا السلام، انہیں توفیق عطا فرمائے کہ اس علم و پرچم کو، جسے وہ اسی قوت کے ساتھ اپنے اختیار میں رکھتے ہیں، اس جنگ میں آگے لے کر چلیں؛ ایسی جنگ جو حقیقتاً حق و باطل کے درمیان جنگ ہے۔ اس جنگ نے پوری دنیا میں ایک لہر پیدا کر دی ہے، اور سب لوگ اپنی الٰہی فطرت کی بنیاد پر، جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾[1]، سمجھ رہے ہیں کہ حق کہاں ہے اور باطل کہاں۔ آج ہم نے خبریں سنیں کہ انگلستان میں تقریباً دس لاکھ افراد اور امریکہ میں لاکھوں افراد میدان میں نکل آئے ہیں اور محاذِ حق اور انقلاب کے حامی ہیں۔ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے۔

خط: اگر آپ ان کے جاری کردہ پیغامات کی روشنی میں ان کا تعارف کرانا چاہیں تو کس طرح کرائیں گے؟

انہوں نے جو آیت تلاوت فرمائی، وہ یہ تھی: «مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا»، وہ اس مقام پر ہیں کہ ہمارا شرعی فریضہ ہے کہ ہم سو فیصد ان کی اطاعت کریں۔ ان کی روحانی حالت مکمل طور پر قابلِ اعتماد اور موجبِ اطمینان ہے۔ ان کا زہد اور تقوائے الٰہی بھی مسلم اور موردِ تأیید ہے۔ کبھی لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم کس کی تقلید کریں؟ میں ان نوجوانوں اور نوعمر لڑکوں کو، جو ابھی سنِ بلوغ کو پہنچے ہیں، آقا سید مجتبیٰ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت کرتا ہوں۔ بہرحال، علم کا پرچم ان کے دوش پر ہے؛ ہمیں چاہیے کہ ان کی مدد کریں اور ان کی کامیابی کے لیے دعا کریں۔

خط: اس مدت کے دوران آپ ان کی روحانی اور روحی قوت کی کوئی علامت بیان فرمائیں گے؟

یہی بات کہ وہ اس منصب، مقام اور مرتبے کے خواہش مند نہیں تھے، خود اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری ان کے دوش پر رکھی ہے۔ ان شاء اللہ، جس اللہ نے یہ بارِ گراں ان کے دوش پر رکھا ہے، وہ یقیناً ان کی مدد بھی فرمائے گا۔ ان شاء اللہ، یہ انتخاب حضرت بقیۃ اللہ الاعظم عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کی تمہیدی بشارتوں میں سے ہو۔

خط: رہبرِ انقلاب، خصوصاً اپنے دوسرے پیغام میں، حضرت صاحب علیہ السلام سے توسل اور استمداد بہت نمایاں طور پر کرتے ہیں؛ پیغام کے آغاز میں بھی اور اختتام پر بھی۔ اس بارے میں آپ کچھ فرمائیں گے؟

میں نے عرض کیا کہ یہ دل ایک الٰہی دل ہے؛ یہ ایک ایسا دل ہے جو امامِ عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے وابستہ ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ اس پیغام کا آغاز بھی حجتِ خدا سے متصل ہے اور اختتام بھی اسی سے۔ خدا کی حجتِ کبریٰ سے مدد طلب کرنا، جو بارگاہِ الٰہی میں سب سے زیادہ عزت رکھنے والے ہیں، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کیفیت بناوٹی یا مصنوعی نہیں، بلکہ فطری اور طبعی ہے، اور پاک و شفاف چشمے کی طرح اندر سے پھوٹتی ہے۔ اگر کسی کی فطرت کا چراغ روشن ہو تو وہ سمجھ سکتا ہے کہ امامِ عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے یہ مدد طلب کرنا کسی تصنع یا بناوٹ کا نتیجہ نہیں ہے۔

ان کی روحانی حالت مکمل طور پر قابلِ اعتماد اور موجبِ اطمینان ہے۔ ان کا زہد اور تقوائے الٰہی بھی مسلم اور موردِ تأیید ہے۔

خط: بعض لوگ اس محبوبیت کو، جو اس وقت لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے پیدا ہوئی ہے، جبکہ وہ انہیں پوری طرح جانتے بھی

---

(۱) سورۂ مبارکہ شمس، آیت ۸۔

نہیں، اللہ تعالیٰ کی عنایت اور لطف کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

قرآنِ کریم فرماتا ہے: «اِنَّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا»[1] یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے؛ وہ لوگ جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، جانتے ہیں کہ اس عالم کا ایک مالک ہے اور ہمارے سامنے ایک دائمی زندگی ہے، اور اہلِ عمل، صالح ہیں۔ لوگوں کی یہ عمومی محبت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان اور عملِ صالح کی توثیق فرمائی ہے۔ یہ محبت معاشرے کے تمام طبقات میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ محبت باغ اور گلستان اگائے گی، بالخصوص نئی نسل میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے؛ وہ نسل جس پر دشمن نے بہت کام کیا تھا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا۔ لیکن بحمد اللہ، یہ نسل اب دوبارہ الٰہی اور روحانی فضا کی طرف لوٹ آئی ہے۔ اس نسل میں صداقت، حقانیت، استقامت، شجاعت اور ایمان موجود ہے اور وہ ان شاء اللہ انقلاب کے پرچم کو اپنے دوش پر اٹھانے کے لیے آمادہ ہے۔

خط: اجتہاد کے موضوع میں آپ نوجوانوں کو، جو تقلید کرنا چاہتے ہیں، ان سے تقلید کرنے کی سفارش کس دلیل کی بنیاد پر کرتے ہیں؟

اکثر فروعی مسائل کا تعلق سماجی اور سیاسی مسائل سے ہوتا ہے؛ حتیٰ کہ اقتصادی مسائل بھی اس دائرے سے الگ نہیں ہیں۔ ہمارے یہ محترم جن کے دوش پر علم کا پرچم ہے، جتنا ہم سب متحد ہو کر آقا کے پیچھے کھڑے ہوں گے، اور جتنی یکجہتی کے ساتھ عوام ولی فقیہ کے پیچھے کھڑے ہوں گے، اتنا ہی اتحاد و انسجام بہتر طور پر قائم ہوگا۔ ولی فقیہ کوئی معمولی بات نہیں ہے؛ حقیقتاً یہ امامِ عصر ارواحنا فداہ کا وہ سایہ ہے جو ہمارے سروں پر سایہ فگن ہے۔ لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہ کریں کہ ہمیں ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

یہ صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے جیسے انقلاب کے آغاز میں ہمارے شہید امام کے انتخاب کے وقت تھی۔ اس وقت بھی تقلید اور مرجعیت کے حوالے سے حوزوی حلقوں میں یہی بحثیں موجود تھیں، لیکن آخر کار دلوں اور جانوں کو ہدایت ملی اور آقا کی مرجعیت بھی واضح تھی، اور یہ مرجعیت صرف ایران تک محدود نہیں تھی۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ مرجعیت کے معاملے میں نوجوانوں کو ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تو اس مرجعیت سے مراد صرف ایران کی مرجعیت نہیں ہے۔ جبہۂ مقاومت میں بھی لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں۔ عالمِ تشیع نے بھی رغبت کے ساتھ اس معاملے کی طرف توجہ کی ہے۔ نوجوانوں کو ان کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت دینے میں بالکل شک نہ کریں۔ یہ امر، ایک طرح سے، اس نورانی ستون کو تقویت دینے کے مترادف ہے، اور یہ امامِ عصر ارواحنا فداہ اور خدائے سبحان کی پسند اور رضامندی کا باعث ہے۔

حادثے کے دن وہ رہبر کے دفتر میں موجود تھے؛ یہاں تک کہ ان کا گھر بھی حملے کی زد میں آیا۔ حادثے سے چند سیکنڈ پہلے وہ صحن میں تشریف لے گئے تھے اور ایک دیوار ان کے اور ملبے کے درمیان حائل ہوگئی، جس کی وجہ سے وہ ایک معجزانہ انداز میں محفوظ رہے۔

حوادث کے سلسلے پر غور کریں؛ جو واقعات پیش آئے، بظاہر شاید ان میں سے بعض ہماری خواہش کے مطابق نہ تھے، لیکن حقیقت میں وہی بات تھی جس کے بارے میں قرآن فرماتا ہے: «عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ»[2]؛ جب انسان اس معاملے کی باطنی حقیقت کو دیکھتا ہے تو اسے سمجھ آتا ہے کہ ان واقعات میں ایک غیبی تدبیر کارفرما تھی،

---

(۱) سورۂ مبارکہ مریم، آیت ۹۶

(۲) ممکن ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ سورۂ بقرہ، آیت ۲۱۶

اور یہ تمام واقعات اس طرح ترتیب دیے گئے کہ معاملہ یہاں تک پہنچے۔ اگر بارہ روزہ جنگ پیش نہ آتی تو جس جنگ میں ہم آج ہیں، اس کے لیے اس طرح تیاری نہ ہوتی۔ جنوری کے فسادات میں لوگوں نے ان وحشیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ گویا یہ تمام واقعات ایک دوسرے کے لیے تمہید اور مقدمہ بن رہے تھے۔

پھر معاملہ یہاں تک پہنچا کہ آقا نہ کسی پناہ گاہ میں، بلکہ اپنے ہی گھر میں، اپنے اہل و عیال کے ساتھ اس طرح شہید ہوئے؛ وہ بھی قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے اور روزے کی حالت میں۔ اس شہادت کی کیفیت اور انداز کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے سامنے ان کے راستے کی صداقت کو ثابت اور مستحکم کر دیا۔

ان واقعات کی برکتوں میں سے ایک یہ تھی کہ لوگوں کے دلوں میں ولی فقیہ کی طلب اور تشنگی پیدا ہوئی؛ کہ ہمیں ولی فقیہ چاہیے، نہ کہ کوئی اور منحوس آواز جو اس حقیقت کے خلاف ہو۔ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے وقت بھی فوراً شہید رہبر کا انتخاب ہو گیا تھا اور ایک دن بھی نہیں گزرا تھا؛ لیکن اس مرتبہ مصلحت یہی تھی کہ معاملہ اس طرح آگے بڑھے تاکہ لوگوں کی تشنگی اور طلب مزید بڑھ جائے۔ اور یہ مدت گزرنے کے بعد بھی، الحمدللہ، معاملہ بہترین انتخاب پر منتج ہوا۔ کیا یہ سب اللہ تعالیٰ کی منصوبہ بندی نہیں ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا: «إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ»[1]۔ اللہ کی نصرت صرف یہ نہیں کہ خدا ٹرمپ کو ہلاک کر دے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کس مقصد کے لیے مجاہدہ کر رہے ہیں اور جانیں کیوں قربان کر رہے ہیں؟ آج دشمن مسلسل عالمی سطح پر پسپائی اور شکست کا سامنا کر رہا ہے۔ دشمن کے پاس کوئی منطق نہیں؛ ایک وحشی، دیوانہ اور مفسد شخص پوری دنیا کے لیے فیصلے صادر کرنا چاہتا ہے۔ یہ جو جزیرے کا مسئلہ پیش آیا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لطف و عنایت کی ان نشانیوں میں سے تھا جن کے ذریعے یہ بات واضح ہوئی کہ ہمارے شہید امام نے جس راستے کی بنیاد رکھی اور جس پر استقامت کا درس دیا، وہ کس درندے اور کس دشمن کے مقابلے میں تھا۔

خط: رہبر کی جانب سے ایک جملہ نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے بعد آنے والی قیادت کے بارے میں فرمایا ہے: «یہ مسئلہ ہمیشہ سے الٰہی رہا ہے۔» آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

شہید رہبر کے انتخاب کے وقت بھی صورتِ حال بالکل اسی طرح تھی۔ آپ نے مجلسِ خبرگان میں دیکھا کہ خود شہید رہبر بھی ابتدا میں اپنے انتخاب کے مخالف تھے، لیکن الٰہی ہدایت اور امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی عنایت سے انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ اور ان تمام دہائیوں کے دوران جب یہ پرچم ان کے کندھوں پر رہا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی اہلیت اور شائستگی کو مزید ثابت کیا اور بارگاہِ الٰہی میں اس امتحان میں بھی سرخرو ہوئے۔

آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کا انتخاب بھی بالکل اسی طرح ہوا۔ حقیقتاً یہ معاملہ ہمارے اختیار سے باہر تھا؛ اللہ تعالیٰ نے اس انتخاب کے لیے تمام مقدمات فراہم کیے اور دلوں کی رہنمائی فرمائی، یہاں تک کہ مجلسِ خبرگان نے پورے عزم اور قاطعیت کے ساتھ انہیں منتخب کیا۔

خط: ان کی حمایت کے حوالے سے اگر آپ کوئی نصیحت یا سفارش کرنا چاہیں تو فرمائیے۔

میری نصیحت یہ ہے کہ عوام اسی اتحاد، یکجہتی اور باہمی ہمدردی کی کیفیت کو برقرار رکھیں، میدان خالی نہ چھوڑیں، اور وہ جو کچھ بھی فرمائیں اور جو بھی فیصلہ کریں، اسے یقین کے ساتھ قبول کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہے۔ عوام ان کی اطاعت کریں، ذرہ برابر بھی شک نہ کریں اور ان کے لیے دعا کریں۔

---

(۱) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ سورۂ محمد، آیت ۷

محرز



آیت اللہ محمود رجبی

گفتگو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی شخصیت میں قیادت کے لیے ضروری اوصاف کا جائزہ

آیت اللہ محمود رجبی (مجلسِ خبرگانِ رہبری کی مجلسِ عاملہ کے رکن)

◆ علمی شخصیت

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای علمی اعتبار سے نہایت ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے بڑے اور نامور اساتذہ سے استفادہ کیا ہے۔ اعلیٰ سطحی دروس کے علاوہ تقریباً ۱۵ سال تک حوزۂ علمیہ کے بزرگ علما کے درسِ خارج میں شرکت کی اور آیت اللہ وحید، آیت اللہ شبیری زنجانی اور شیخ جواد تبریزی جیسے جلیل القدر علما سے فیض حاصل کیا۔ دورانِ تحصیل، آیت اللہ مؤمن کے درس کے علاوہ بھی، چونکہ وہ مباحث کو زیادہ وسیع اور گہرائی کے ساتھ آگے بڑھانے میں دلچسپی رکھتے تھے، دوسرے اساتذہ کے دروس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ وہ دروس میں فعال، تنقیدی اور پُرجوش شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہی چیز علمی اعتبار سے ایک بڑا ذخیرہ فراہم کرتی ہے اور انسان کو بلند علمی مقام تک پہنچاتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تقریباً ۱۵ سال تک فقہ و اصول میں درسِ خارج دیتے رہے۔ اتنے طویل عرصے تک درسِ خارج کی تدریس، ان کے ملکۂ اجتہاد کی ایک واضح علامت ہے۔

اگرچہ آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای نے آیت اللہ مؤمن کی خدمت میں نسبتاً مختصر مدت گزاری، لیکن آیت اللہ مؤمن نے ان کے بارے میں فرمایا تھا: «وہ علمی اعتبار سے بہت مضبوط ہیں۔»

آیت اللہ مؤمن کے درسِ خارج کے بعض مباحث بھی انہوں نے اپنے قلم سے تحریر کیے ہیں۔ حوزہ علمیہ کے متعدد ممتاز اور صاحبِ نظر اساتذہ نے ان تحریرات کا مطالعہ کیا اور کہا کہ یقیناً جس شخص نے یہ مطالب تحریر کیے ہیں، وہ مجتہد ہے۔ بلکہ بعض علما نے یہ بھی کہا کہ ہم نے اسی موضوع پر آیت اللہ خوئی اور دیگر بزرگ علما کی تحقیقات کا بھی مطالعہ کیا ہے اور خود بھی اس سلسلے میں تحقیق و غور کیا ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ نے کہا کہ میں نے خود تقریباً ۱۰۰ صفحات پر تحقیق کی ہے؛ اگر آیت اللہ سید مجتبیٰ کی تحریر ان تحقیقات سے بہتر نہ ہو تو کم از کم ان کے ہم پلہ ضرور ہے۔ لہٰذا فقہ، اصول اور اجتہاد کے میدان میں ان کا مجتہد ہونا مسلم اور قطعی ہے اور اس بارے میں کسی قسم کا شک و تردد نہیں ہے۔

دوسرے علمی میدانوں، مثلاً علمِ رجال میں بھی آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای نے خود تحقیق کی ہے؛ کیونکہ فقہ کے لیے علمِ رجال کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص علمِ رجال میں بھی اجتہادی مہارت نہ رکھتا ہو تو وہ مضبوط اور مستحکم اجتہاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح دیگر وہ علوم بھی، جن میں مجتہد کے لیے مہارت ضروری ہے اور جو اجتہاد کے لوازم میں شمار ہوتے ہیں، ان پر بھی انہیں کامل دسترس حاصل ہے۔

◆ سیاسی شخصیت

سیاسی و سماجی مباحث کے اعتبار سے بھی، انصاف کے ساتھ کہا جائے تو وہ ایک ممتاز شخصیت کے حامل ہیں۔ ان مسائل میں بھی انہیں گہری واقفیت حاصل ہے اور وہ صاحبِ نظر ہیں۔ جناب حداد عادل بیان کرتے تھے کہ جب آقا نے ہماری بیٹی کے لیے رشتہ بھیجا، تو ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس موقع پر انہوں نے مجھ سے فرمایا: " جان لیجیے کہ جو شخص آپ کا داماد بننے والا ہے، سیاسی بصیرت کے اعتبار سے میری اولاد میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب ہے۔" مقامِ معظم رہبری نے اپنی اس بصیرت کے ساتھ واقعی بے نظیر انداز میں فرمایا کہ اس اعتبار سے مجھ سے سب سے قریب آقا سید مجتبیٰ ہیں۔ البتہ مقامِ معظم رہبری نے کبھی بھی اپنی اولاد کو کوئی رسمی عہدہ نہیں دیا؛ مثلاً کسی سرکاری مقام، ادارے یا حکومتی منصب پر مقرر نہیں کیا۔ تاہم اس کے باوجود مختلف میدانوں میں، بغیر کسی رسمی عنوان کے، انہیں بعض ذمہ دا ریاں سونپی جاتی تھیں۔ مثلاً انقلابی قوتوں کو منظم کرنا، جو ایک سیاسی و سماجی نوعیت کی ذمہ داری تھی۔

انہوں نے کچھ عرصہ قم میں تعلیم حاصل کی، پھر تہران چلے گئے۔ بعد میں جب وہ دوبارہ قم واپس آنا چاہتے تھے تو مقامِ معظم رہبری نے فرمایا: "فی الحال تہران میں رہیں اور ان انقلابی قوتوں کو، جو سب انقلاب سے وفادار ہیں لیکن مختلف سیاسی و فکری رجحانات رکھتے ہیں، ایک وحدت اور انسجام عطا کریں۔" چنانچہ وہ اس کام کے ذمہ دار ہوئے۔ انہوں نے خود ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ انقلاب کی مختلف قوتوں کے درمیان ہم آہنگی، اتحاد اور باہمی تعاون پیدا ہو اور وہ بہتر طور پر انقلاب کے اہداف کے حصول میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

دیگر معاملات میں بھی کبھی ایسا ہوتا کہ کسی ذمہ دار شخص کو آقا سے ملاقات اور رابطے کی ضرورت ہوتی، یا خود آقا کا کوئی پیغام ہوتا اور رابطے کی ضرورت پیش آتی۔ اس موقع پر آقا فرماتے تھے: "یہ ہمارے اور آپ کے درمیان واسطہ ہیں؛ جب یہ کوئی بات کہیں تو اطمینان رکھیں کہ یہ میری ہی بات پہنچا رہے ہیں۔" یعنی عملی طور پر وہ نظام کے مختلف شعبوں اور مسائل میں، بغیر کسی رسمی عہدے کے، اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ وہ مداخلت کے بجائے مختلف امور میں منصوبے اور تجاویز پیش کرتے اور مقامِ معظم رہبری کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانے میں مدد دیتے تھے۔ اگر کسی منصوبے میں کوئی مسئلہ نظر آتا اور ان کی تجویز اس مسئلے کو حل کر سکتی تو وہ اس سلسلے میں اپنی رائے اور حل پیش کرتے۔ انہوں نے رہائش، زرعی شعبے میں تبدیلی، اقتصادی مسائل اور مصنوعی ذہانت جیسے مختلف موضوعات میں بھی فعال طور پر غور و فکر کیا۔ زرعی شعبے، خصوصاً پانی سے متعلق مسائل کے ایک ذمہ دار شخص بیان کرتے ہیں کہ ایک نشست میں حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی نے ان سے ایک سوال کیا۔ وہ کہتے تھے: "میں بہت سے ذمہ داران کو رپورٹ پیش کرتا تھا تو وہ صرف یہ کہتے تھے کہ بہت اچھا ہے وغیرہ؛ لیکن واحد شخص جو میرے ساتھ فنی اور تخصصی گفتگو کرتے، اپنی رائے دیتے اور تجاویز پیش کرتے تھے، وہ آقا سید مجتبیٰ تھے۔" یعنی اپنی غیر معمولی ذہانت اور استعداد کے ساتھ جس میدان میں بھی وہ داخل ہوتے، ان کا کردار محض تائید کرنا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ مسئلے پر غور کرتے، اپنی رائے دیتے اور اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے عملی تجاویز پیش کرتے تھے۔ لہٰذا ملک کے حالات اور اس کے مسائل پر ان کی گہری نظر اور واقفیت مسلم ہے۔ وہ ملک کے مسائل کے حل کے لیے مختلف راستوں اور عملی تدابیر پر غور کرتے تھے۔ ایک بزرگ کا کہنا تھا کہ ان کے پاس ملک کے مسائل حل کرنے کے لیے متعدد منصوبے اور حل موجود ہیں۔

مزاحمتی محاذ کے مسائل میں بھی ایک باخبر شخص بیان کرتے تھے: ''میں مختلف افراد کو مزاحمتی محاذ کی صورتِ حال کے بارے میں رپورٹ دیتا تھا، لیکن جب انہیں رپورٹ دیتا تو ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ خود وہیں موجود رہے ہوں اور تمام حالات سے واقف ہوں۔'' یعنی مزاحمتی محاذ کے مسائل میں بھی انہیں گہری مہارت اور مکمل واقفیت حاصل تھی۔ مسلح افواج کے اعلیٰ سطحی ذمہ داران سے بھی ان کے روابط تھے اور وہ کبھی کبھی ان سے مشورہ لینے کے لیے آتے تھے۔ ایک محترم نے بیان فرمایا: ''میں نے ان سے ملاقات کے لیے وقت لیا تھا۔ جب وہاں پہنچا تو دیکھا کہ میرے آنے سے پہلے وہ شہید سلامی کے ساتھ فوجی اور دفاعی مسائل پر نشست میں مصروف تھے۔'' غرض یہ کہ اگرچہ ان کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا، لیکن ملک کے مختلف شعبوں کے مسائل اور مشکلات میں ان کی عملی موجودگی، منصوبے اور تجاویز پیش کرنا اور اپنی رائے دینا ان کی نمایاں خصوصیات میں سے تھا۔

> رہبری نے آقا مجتبیٰ سے فرمایا تھا: ''فی الحال تہران میں قیام کریں اور انقلابی قوتوں کو متحد اور منسجم کریں۔''

بہت سے لوگ ان سرگرمیوں سے واقف نہیں تھے اور نہ ہی خود ان کی طرف سے کبھی یہ دعویٰ کیا گیا کہ وہ ان معاملات میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم نے تحقیق کی اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ محاذِ مقاومت کے مسائل پر شہید حاج قاسم سلیمانی اور سید حسن نصر اللہ کے ساتھ بھی نشستیں کرتے تھے اور اس میدان کے حالات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ سید حسن نصر اللہ کی شہادت کے بعد بھی ان کی بعض نشستیں جاری رہیں۔ آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب کے بعد وہاں موجود لوگوں کو بھی بہت حوصلہ ملا اور یہ انتخاب ان کے لیے تقویتِ قلب اور خوشی کا باعث بنا۔ لہٰذا آئینِ اسلامی جمہوریہ میں رہبر کے لیے جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں، ان کی روشنی میں ہمارے لیے یہ امر واضح ہو گیا کہ اگرچہ انہوں نے کبھی خود کو منظرِ عام پر نہیں لایا تھا، لیکن جب ہم نے ان اوصاف کے بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ الحمدللہ ان میں یہ خصوصیات نہ صرف موجود ہیں بلکہ بہت سے دوسرے افراد کے مقابلے میں زیادہ نمایاں اور اعلیٰ درجے پر ہیں۔

مسائلِ سیاسی میں ان کی بصیرت، دشمن کے مقابلے میں ان کی شجاعت اور استکبار ستیزی ان کی اہم خصوصیات میں سے ہیں۔ مقامِ معظم رہبری نے آئندہ رہبر کے بارے میں خبرگان کے ایک گروہ سے خصوصی طور پر دو چیزوں پر زور دیا تھا: ایک استکبار مخالف ہونا، جو انتہائی اہم ہے، اور دوسرا پاک دستی اور مالی دیانت۔ کیونکہ رہبر کے زیرِ اختیار بہت بڑی مالی ذمہ داریاں اور وسائل ہوتے ہیں، اس لیے یہ دونوں خصوصیات نہایت اہم ہیں۔ الحمدللہ، ان دونوں میدانوں میں بھی وہ انتہائی بلند مقام پر ہیں۔ ان کی سادگی اور زہد کا یہ عالم تھا کہ شادی کے بعد ایک عرصے تک ان کے گھر میں قالین تک نہیں تھا۔ ان کے پاس صرف ایک فرش تھا جو کمرے کے نصف حصے کو ڈھانپتا تھا، جبکہ ان کا گھر بھی کرائے کا تھا۔ یعنی اتنی بھی مالی استطاعت نہیں تھی کہ وہ پورے گھر میں کارپٹ بچھا سکیں۔ یہ ان کے زہد اور سادہ طرزِ زندگی کی ایک مثال ہے۔

◆ روحانی شخصیت

تقویٰ کے لیے جو روحانی پہلو ضروری ہوتے ہیں، وہ بھی الحمدللہ ان میں موجود ہیں، اور انہوں نے بڑے اساتذۂ اخلاق سے استفادہ کرتے ہوئے ان پہلوؤں میں تربیت حاصل کی ہے۔ وہ مرحوم آیت اللہ بہاء الدینی، آیت اللہ کشمیری، آیت اللہ احمدی

میانجی اور دیگر ممتاز اساتذۂ اخلاق سے وابستہ رہے اور ان کی تربیت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک رہبر کے لیے جس روحانی پختگی، روحانی تربیت اور شخصیت کے مضبوط ڈھانچے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ خصوصیات ان میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں مقامِ معظم رہبری کی جانب سے اپنی اولاد کی تربیت کے لیے اختیار کیا گیا تدبیر اور طریقۂ تربیت بھی واقعی ایک قابلِ تقلید نمونہ ہے۔

◆ ایک شبہے کا جواب

آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب کے حوالے سے جو دو شبہے کبھی کبھی پیش کیے جاتے ہیں، ان کے بارے میں چند وضاحتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ موروثی قیادت کا شبہ: موروثی ہونے سے مراد یہ ہے کہ معیار صرف یہ ہو کہ یہ شخص سابق رہبر کا فرزند ہے۔ حالانکہ آئینِ اسلامی جمہوریہ ایران میں اس مسئلے کو نہایت واضح اور دقیق انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر رہبر کا انتقال ہو جائے یا وہ شہید ہو جائیں تو اگلے رہبر کے انتخاب کا طریقۂ کار اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ اگر کوئی شخص مجتہد، عادل، مدیر، مدبر، شجاع اور متقی نہ ہو، یا ملک کے انتظام و انصرام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو وہ رہبر نہیں بن سکتا۔ اب اگر کسی شخص میں یہ تمام شرائط موجود ہوں اور وہ سابق رہبر کا فرزند بھی ہو تو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ اصل معیار یہ ہے کہ وہ شخص رہبری کے لیے زیرِ غور تمام افراد کے مقابلے میں ان شرائط میں برتری رکھتا ہو۔ آئین میں یہ شرط کہیں نہیں رکھی گئی کہ رہبر، سابق رہبر کا فرزند نہیں ہونا چاہیے۔ کیا یہ عقلِ سلیم کے مطابق ہے کہ ہم کہیں کہ ایک شخص تمام مطلوبہ شرائط میں دوسروں سے برتر ہے، لیکن صرف اس لیے اسے منتخب نہ کیا جائے کہ وہ سابق رہبر کا فرزند ہے؟

آئین کے مطابق مجلسِ خبرگان کو ان تمام افراد کا جائزہ لینا ہوتا ہے جو رہبری کے لیے موزوں اور زیرِ غور ہوں، اور اگر ان میں سے کوئی شخص دوسروں سے برتر ہو تو اسے منتخب کیا جائے؛ اور اگر چند افراد مساوی حیثیت رکھتے ہوں تو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کیا جائے۔ یہاں اگرچہ بہت سے حضرات کی نظر میں دوسرے افراد اصلاً قابلِ موازنہ نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود ان کے نام بھی زیرِ غور آئے اور ان کے بارے میں رائے شماری کی گئی۔ لہٰذا موروثی قیادت کا ذرّہ بھر بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔

عوام نے مجلسِ خبرگان کے انتخابات میں ایسے افراد کو ووٹ دیا تھا جو ان ذمہ داریوں اور شرائط کے حامل تھے، پھر انہی منتخب نمائندوں نے ایک آزاد ماحول میں، جبکہ دیگر افراد بھی زیرِ غور تھے، رائے شماری کے ذریعے رہبر کا انتخاب کیا۔ لہٰذا اس انتخاب میں موروثی قیادت کا ذرّہ بھر بھی شبہ نہیں تھا۔

> + مقامِ معظم رہبری نے خبرگان کے ایک گروہ کے سامنے آئندہ رہبر کے بارے میں خصوصی طور پر دو چیزوں پر زور دیا تھا: ایک استکبار مخالف ہونا اور دوسرا مالی پاکیزگی۔

۲۔ رہبری کے منصب سے ممانعت کا شبہ: دوسرا مسئلہ جو بعض اوقات پیش کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ سابق رہبر نے اپنے فرزندان کے لیے نظام میں کسی سرکاری عہدے کو حاصل نہ کرنے کی بات کی تھی۔ بعض لوگوں نے غلطی سے اس بات کو اس طرح عام کر دیا کہ ان کے فرزندان کو کبھی بھی کسی قسم کی ذمہ داری یا منصب نہیں مل سکتا۔ حالانکہ یہ بات اس مفہوم میں نہیں تھی۔ رہبر کا انتخاب مجلسِ خبرگان کی ذمہ داری ہے؛ خبرگان جس شخص کو منتخب کریں گے، وہ رہبر منتخب ہوگا۔ خود مقامِ معظم رہبری نے نہ اس انتخاب

کی تائید کی تھی اور نہ مخالفت، بلکہ نفیاً و اثباتاً کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی۔ خبرگان کے بعض معزز اراکین نے فرمایا کہ میں نے خود خاص طور پر جانشین کے بارے میں سوال کیا تھا، تو مقامِ معظم رہبری نے فرمایا تھا: "میں نفیاً و اثباتاً کوئی رائے نہیں دیتا۔"

ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کا لطف اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم ﷺ کی عنایات ہماری قوم کے شاملِ حال ہوئیں اور ہمارے شہید رہبر کے خلفِ صالح نے رہبری کی ذمہ داری سنبھال لی؛ وہ شخصیت جس کے بارے میں ہمیں اطمینان ہے کہ ان کی خصوصیات اور بصیرت مقامِ معظم رہبری سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔

ہمیں اطمینان ہے کہ آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے ذریعے امام خمینی ﷺ اور ہمارے شہید رہبر کا وہی راستہ پوری قوت کے ساتھ جاری رہے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم ﷺ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے دلوں کو اس وجودِ شریف کی طرف متوجہ فرمایا۔

میں بھی بحیثیت ایک طالبِ علم، اپنے دل کی گہرائیوں سے اور اس معرفت کے ساتھ کہ نظریۂ ولایتِ فقیہ، اسلامِ نابِ محمدی کے مسلّم اصولوں میں سے ایک ہے، اور یہ وہ نظریہ ہے جو عالمی سطح پر حکمرانی اور نظامِ حکومت کے بہترین نظریات میں سے ایک کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، اس اعتقاد کے ساتھ کہ وہ امام زمانہ ﷺ کے نائب ہیں، ان سے بیعت کرتا ہوں اور جان کی بازی تک اس بات کے لیے آمادہ ہوں کہ جس طرح وہ حکم فرمائیں، ان کے فرامین کی اطاعت کروں۔

میرے نزدیک یہ انتخاب، لوگوں کی اپنے شہید رہبر سے وفاداری اور محبت کا صلہ تھا۔ ہم نے دیکھا کہ عوام نے میدانِ معاشرہ کو خالی نہیں چھوڑا۔ مرحوم آیت اللہ مصباحؒ فرمایا کرتے تھے: "اگر ہم اپنی ذمہ داری ادا کریں تو خدا خوب جانتا ہے کہ ہمیں کس طرح اجر اور پاداش دینا ہے۔" یہ انتخاب ہماری امت کی اسی ایثار، وفاداری اور ولایت مداری کا صلہ تھا۔

ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت و قیادت طویل عرصے تک امتِ اسلامی، بالخصوص ہماری قوم کے سروں پر قائم رکھے، انہیں اپنی پناہ میں محفوظ رکھے، ہر روز ان کی عزت و اقتدار میں اضافہ فرمائے، اور وہ پرچم جس کے بارے میں ہم سمجھتے تھے کہ ان کے محترم والد کے ہاتھوں حضرت بقیۃ اللہ الاعظم ﷺ تک پہنچے گا، ان کے ہاتھوں حضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہو۔

اور ان شاء اللہ، ان کی رہبری کا دور حضرت ولی عصر ﷺ کے ظہور کی تمہید اور اس کے لیے زمین ہموار کرنے کا دور ثابت ہو۔





پیامِ امت (۳)

جناب سید مجتبیٰ کے پیغامات پر گروہی سوچ بچار

مہدی قریب

اشارہ: پیشِ نظر متن جناب سید مجتبیٰ کا شہید امام خامنہ ای کی شہادت کے چالیسویں دن، چہلم کی مناسبت کے پیغام پر گروہی سوچ بچار کا نتیجہ ہے، جو خانۂ طلابِ جوان کے چند اراکین نے انجام دیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر افراد حوزہ علمیہ کے نوجوان اہلِ فضل ہیں، جو رائج حوزوی تعلیمات اور اعلیٰ سطح کے دروس کی تدریس کے علاوہ، مکتبِ امامینِ انقلاب کے محققین میں بھی شمار ہوتے ہیں۔ یعنی انہوں نے ا مام خمینیؒ اور امام شہید کے بہت سے متون کا مطالعہ کیا ہے، ان پر بحث و گفتگو اور فکری تبادلہ کیا ہے، اور ان دونوں عظیم شخصیات کے افکار کے بعض ابواب کو اپنے اجتماعی اور انفرادی تحقیقی موضوعات بھی بنایا ہے۔ نشریہ خط، اس نشست کے نکات پیش کرتے ہوئے، آپ کو بھی جناب سید مجتبیٰ کے متون کے اجتماعی مطالعے کے اس شیریں اور قیمتی تجربے کی دعوت دیتا ہے۔

تیسرا پیغام

آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کا امت کے عظیم پیشوا امامِ عزیز کی شہادت کے چالیسویں روز اور مسلط کی گئی تیسری جنگ سے متعلق اہم مسائل کے بارے میں پیغام

◈ پیغام کے آغاز ہی میں شہید امام کے ذکر کے ساتھ ایک بار پھر عوام کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ ہر مناسبت اور ہر پیغام کو عوام کے مرتبے اور مقام کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا موقع بناتے ہیں؛ ایسی امت جو مبعوث ہوئی اور شہید امام کے ساتھ بے مثال ہم آہنگی و نسبت پیدا کرتے ہوئے خود امام کا مقام اختیار کر گئی ہے۔

"چالیس شب و روز گزر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کے پیشوا کو اپنی میقات کی جانب بلا لیا ہے؛ لیکن اس مرتبہ، برخلاف اس کے جو حضرت کلیم اللہؑ کے زمانے میں پیش آیا تھا، شہید رہبر کے اصحاب اور ان کی امت حق کے قیام اور باطل کے مقابلے کے لیے مبعوث ہوئے اور سامری اور اس کے بچھڑے کے مقابل پہاڑوں کی مانند استقامت کے ساتھ ڈٹ گئے اور دہکتے ہوئے آتشین شراروں کی مانند حملہ آوروں اور فرعونیوں کے سروں پر آگرے ہیں۔

خمینی کبیر اور خامنہ ای عزیز شہید کے غیرت مند فرزند اور اسلام ناب محمدی ﷺ کے پیروکار، بے مثال عزم و شجاعت کے ساتھ میدانوں، سڑکوں اور محاذوں پر موجود ہیں اور دشمن کے وحشیانہ حملے سے پہنچنے والے نقصانات اور صدمات کے باوجود، مسلط کی گئی تیسری جنگ کو تیسرے مقدس دفاع کی حماسی داستان میں تبدیل کر چکے ہیں۔ ایران کی بیدار اور باشعور قوم نے اگرچہ یہ دکھایا کہ وہ اپنے شہید پیشوا کی جدائی کے عظیم غم میں سوگوار ہے، لیکن عاشورائے حسینی کے بلاواسطہ وارثوں کی پیروی کرتے ہوئے اس غم سے حماسی داستان اور اس مرثیے سے رجز تخلیق کیا ہے۔ ان تمام چیزوں نے دشمن کو، جو ہر طرح کے اسلحے سے لیس تھا، حیرت و بے بسی میں مبتلا کیا اور دنیا کے آزاد انسانوں کو تحسین پر مجبور کر دیا ہے۔"

◈ شہید امام کی زندگی اور شہادت آقا مجتبیٰ کے لیے سرچشمۂ الہام ہے اور یہ ایسی چیز نہیں جسے وہ پوشیدہ رکھتے ہوں۔ شہادت کے وقت آقا کا مٹھیاں بھینچنا، آقا مجتبیٰ کے نزدیک ان کی جہاد سے بھرپور زندگی، استقامت اور راہِ حق میں ثابت قدمی کی ایک علامت ہے۔ اس کے ساتھ شہید امام کی زندگی اور وقتی تقاضے کے سلسلے میں ایک واقعہ جو آقا مجتبیٰ کے لیے نہایت بامعنی ہے، وہ ان کا قم میں جاری پُر حرارت درس و بحث کو ترک کر کے اپنے والد کی خدمت کے لیے مشہد کا سفر کرنا ہے۔ آقا مجتبیٰ اس واقعے کو ان تمام دیگر زحمات کے ہم پلہ رکھتے ہیں جو آقا نے اپنی جدوجہد کے راستے میں برداشت کیں اور اس واقعے کو ایک خاص انداز میں یاد کرتے ہیں؛ شاید اگر قدرے بے تکلفی سے اور آزاد تعبیر میں کہیں تو ان کا مفہوم یہ ہے کہ: یہ واقعہ ایک طرف، اور باقی سب کچھ دوسری طرف!

"شاید ان عنایات اور توجہات کو اس محترم شخصیت کی جانب متوجہ کرنے والی چیز کو کلمہ حق کی سربلندی کی راہ میں ان کی مسلسل اور مخلصانہ کوشش و مجاہدت میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بالخصوص خائن پہلوی حکومت کے نظام سے مقابلے کی مشکلات کے علاوہ، انہوں نے ادائے فریضہ کی راہ میں ایک اور خاص موقع سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا، جس سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں۔ تقدیرِ الٰہی میں یوں لکھا تھا کہ علم کے شدید شائق اور عمل کے طالب اس نوجوان سید نے، ایسے وقت میں جب ان کے والد مکرم نابینائی کے خطرے سے دوچار تھے، برسوں جلیل القدر اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کے بعد، قم میں اپنی علمی ترقی اور مستقبل بنانے کے تمام ظاہری مواقع کو چھوڑ دیا اور اللہ کے فضل پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے والد کے لیے وقف کر دیا۔ اس ایثار کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا فضل اس طرح ظاہر ہوا کہ اچانک سید علی خامنہ ای تیس سال کی عمر سے پہلے خراسان سے ایک سورج کی مانند طلوع ہوئے اور بہت جلد فکری اور انقلابی میدان کے اہم ستونوں میں شمار ہونے لگے، اور اسی دوران متداول علوم میں بھی قابلِ ذکر ترقی حاصل کی؛ یہاں تک کہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ساواک نے انہیں "خمینیِ خراسان" کا لقب دے رکھا تھا۔ ہماری اس نکتے پر تاکید ہے کہ محترم شخصیت کی باطنی اور ظاہری ترقی کا یہ سفر بعد کے مراحل میں بھی اسی طرح جاری رہا۔"

◈ آقا مجتبیٰ نے اگرچہ پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ آقا کے جوار میں زندگی گزاری ہے، لیکن وہ معاصرت اور مجاورت کے حجاب کا شکار نہیں ہوئے۔

"امامِ شہید ایک ایسے مرد تھے کہ جتنا وہ مشہور تھے، اتنا پہچانے نہیں گئے۔"

◈ آقا مجتبیٰ کی امامِ شہید کے بارے میں توصیف، خود ان کی اپنی شخصیت کے بعض جلووں کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ اگر ان کی نگاہ فکر اور تزویراتی بصیرت سے مسلح نہ ہوتی، تو وہ آقا کی شخصیت کے ان پہلوؤں کو اس طرح منظرِ عام پر نہ لا سکتے۔

"ان کا عظیم ہنر، جس پر کم توجہ دی جاتی ہے، یہ تھا کہ وہ عوام کے عظیم مجموعوں اور مختلف سماجی گروہوں کے افکار، رویّوں اور جذبات کی تشکیل کے ذریعے معاشرے کی تربیت و پرورش کرتے تھے۔"

"ان کا ایک اور ہنر دور اندیشی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، خصوصاً اپنے زعامت و قیادت کے ابتدائی برسوں میں، بامقصد ادارے تشکیل دینا تھا۔"

"ان کا ایک اور ہنر ملک کے عسکری ڈھانچے کو مضبوط اور طاقتور بنانے کی کوشش تھی، جس کے مثبت آثار سے ملتِ ایران گزشتہ دو مسلط کردہ جنگوں میں آگاہ بھی ہوئی اور مستفید بھی۔"

"اسی طرح مختلف میدانوں، خواہ وہ علمی ہوں، تزویراتی ہوں یا تدبیر مملکت سے متعلق، ان کی تخلیق و آغازِ کار کی قوت بھی ان کے دیگر نمایاں ہنروں میں سے تھی، جس کی ایک جھلک نظام کی عمومی حکمت عملیوں کی تدوین میں منعکس ہوتی ہے۔ نیز بروقت نئے الفاظ اور بدیع تراکیب وضع کرنے کے ذریعے معانی پیدا کرنے کی ان کی قدرت بھی قابلِ ذکر تھی؛ ایسے الفاظ اور تراکیب جو ہر ایک معانی کے ایک وسیع ذخیرے کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے اور جن سے ایک عمومی فکری و عملی مخصوص گفتگو تشکیل پاتی تھی۔"

◈ پہلا پیغام جو «جنگی خاموشی» کے دور سے متعلق تھا؛ ضروری تھا کہ اس میں موجودہ صورتِ حال کی وضاحت کی جائے اور ضروری رہنمائی فراہم کی جائے۔ اسی پیغام میں «خیابان»[1] کا ذکر ہوا، جس کے ذریعے اس امر کو مستحکم کیا گیا، نیز دیگر اہم مؤقف بھی بیان کیے گئے جو ملت کی آئندہ جدوجہد کی بنیاد بننے والے تھے۔

"یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم ان مجرم اور تجاوز کرنے والوں کو، جنہوں نے ہمارے ملک پر حملہ کیا، ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ ہم ضرور ایک ایک نقصان کا معاوضہ، شہداء کا خون بہا اور اس جنگ میں زخمی ہونے والے مجاہدین کا حقِ دیہ طلب کریں گے اور یقیناً آبنائے ہرمز کے انتظام و مدیریت کو ایک نئے مرحلے میں داخل کریں گے۔ ہم جنگ کے خواہاں نہ پہلے تھے اور نہ اب ہیں، لیکن کسی بھی صورت اپنے مسلمہ اور جائز حقوق سے دستبردار نہیں ہوں گے اور اس سلسلے میں ہم پورے جبہۂ مقاومت کو متحد و یکجا سمجھتے ہیں۔"

◈ اس پیغام میں وہ دشمنوں کے مقابل ملتِ ایران کی قطعی فتح کا اعلان کرتے ہیں۔ اس پیغام کے بعد ان کی گفتگو میں فتح و کامیابی کی گفتگو، ایران کی طاقت کے آشکار ہونے کے ساتھ دنیا کے ایک نئے دور کے آغاز اور اسلامی تمدن و دور دراز افقوں کے بارے میں صراحتِ بیان زیادہ نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے، اور رفتہ رفتہ ان کی تمدنی نگاہ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

◈ آقا سید مجتبیٰ فرماتے ہیں کہ ملت نے جو مجاہدات کی اور جن مصائب و بلاؤں کو اپنے جان و دل پر برداشت کیا، ان کے باعث تمدنی نگاہ ایک عمومی رجحان بن گئی ہے اور اس نے امت کے سیر و سلوک اور ارتقائی سفر کی رفتار کو تیز کر دیا ہے۔ یہ امامِ شہید کے ساتھ لوگوں کی بڑھتی ہوئی فکری و روحانی ہم آہنگی کا ایک اور جلوہ ہے۔

"ان دنوں بہت سے لوگ دور دراز افقوں پر نگاہیں مرکوز کر کے ایک تمدنی نگاہ کا تجربہ کر رہے ہیں اور اپنے لیے ایک ایسی تصویر تخلیق کر رہے ہیں جو خیالی نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی حقیقتوں پر استوار ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو کچھ عرصہ پہلے تک صرف چند افراد میں نظر آتی تھی، جن کے سرخیل رہبرِ شہید تھے۔ یہی وہ امر ہے جس کے باعث ہر صاحبِ نظر اس ملت کی تیز رفتار اور معجزہ نما ترقی کو محسوس کر سکتا ہے۔"

---

(۱) آمریکا اور اسرائیل کی طرف سے تیسری مسلط کردہ جنگ کے دوران کی راتوں میں، عوام مسلسل اور بلا وقفہ ہر شب چوراہوں اور سڑکوں پر نکلتے تھے اور پرچم لہرا کر، ترانے پڑھ کر، نعرے لگا کر اور حضراتِ معصومین علیہم السلام سے توسل کر کے، حتمی فتح تک اپنے وطن کی حمایت کا اعلان کرتے تھے۔ ان راتوں میں پورے اسلامی ایران میں حماسی اور معنوی جذبے کے دلنشیں مناظر تخلیق ہوئے۔



جس دن ضرورت ہوگی، اللہ خود دلوں کی رہنمائی فرمائے گا

آیت اللہ محسن اراکی

انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے اسلامی انقلاب کی قیادت کے لیے انتخاب کے حوالے سے آیت اللہ محسن اراکی (مجلسِ خبرگانِ رہبری کے مجلسِ عاملہ کے رکن) کے ساتھ گفتگو

پیشِ نظر متن درحقیقت آیت اللہ محسن اراکی کی ٹیلی وژن پروگرام «تیسرے رہبر» میں کی گئی گفتگو کے مرتب اور مدوّن شدہ متن پر مشتمل ہے، جسے عزیز قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔ جنگ کے ایام میں حفاظتی پابندیوں کے باعث معزز مجلسِ خبرگان، بالخصوص مجلسِ عاملہ کے اراکین تک رسائی کسی قدر دشوار ہوگئی تھی۔ اسی وجہ سے خط نے اپنے مواد کی تکمیل کے لیے ناگزیر طور پر اس محفوظ شدہ انٹرویو سے استفادہ کیا ہے۔

خط: چونکہ آپ مجلسِ خبرگانِ رہبری کی عاملہ کے رکن ہیں، اگر ممکن ہو تو ہمارے لیے نئے رہبر کے انتخاب کے عمل اور اس کے مراحل کے بارے میں بیان فرمائیں اور یہ بھی کہ آپ اس فیصلے تک کیسے پہنچے؟

اسلام کے عظیم مرد، قائدِ عظیم الشان، حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کی شہادت پر تعزیت پیش کرتا ہوں؛ یہ سانحہ عالمِ اسلام، ایران اور دنیا بھر کے مستضعفین کے لیے ایک عظیم صدمہ تھا۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے جانشین، ایران کے عوام اور تمام اہلِ ایمان کی جدوجہد کے ذریعے، جنہوں نے ان کی اطاعت کو اپنے عمل کا سرلوحہ قرار دیا ہے، کسی حد تک اس عظیم نقصان کی تلافی فرمائیں گے؛ ان شاء اللہ۔

اسلامی جمہوریہ کے عظیم افتخارات میں سے ایک اس کا آئین ہے۔ اس آئین نے اپنی افادیت کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔ جب کسی ملک کے نظامِ قیادت میں خلا پیدا ہوتا ہے تو فطری طور پر سیاسی نظام کو ایک سنگین نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں آئین کا یہ امکان کہ وہ بغیر کسی تناؤ اور کشیدگی کے، انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ سیاسی نظام کو آگے بڑھائے اور اس کے استحکام و تسلسل کو یقینی بنائے، اس کی کارآمدی کی سب سے بڑی علامت ہے۔

اصلاً مجلسِ خبرگان عصرِ حاضر کی سیاسی فکر میں ایک عظیم اور منفرد ابداع ہے؛ ایک ایسی مجلس جو حقیقی معنوں میں معاشرے کے حکیموں اور داناؤں پر مشتمل ہے۔ کیونکہ ہماری فقہ کا مفہوم درحقیقت حکمت ہی ہے؛ اسلامی فقہ معاشرے کے نظم و انتظام کا ایک حکیمانہ نظام ہے۔ اسی بنیاد پر مجلسِ خبرگان، فقہا کی ایک مجلس ہے؛ ایسے فقہا جو سیاست، موجودہ دور کے سماجی و سیاسی تقاضوں اور معاصر معاشرے کی پیچیدگیوں سے واقف ہیں۔ ایسی مجلس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس مجلس نے اپنی افادیت ایک مرتبہ سابق رہبر کے انتخاب میں ثابت کی اور دوسری مرتبہ حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب میں۔ یہ دوسرا انتخاب بھی بہت عظیم، دقیق، دانشمندانہ اور تاریخِ اسلام میں کم نظیر انتخاب تھا۔

ایسے حالات میں جب دنیا کی تمام استکباری طاقتوں نے ہماری قوم پر جنگ مسلط کر رکھی تھی. عین جنگ کے دوران بھی ایسے لوگوں کے ساتھ واسطہ تھا جو کسی بھی اصول و ضابطے کے پابند نہیں تھے اور واضح طور پر اعلان کر چکے تھے کہ وہ مجلسِ خبرگان کے ایک ایک رکن کو قتل کرنا چاہتے ہیں، تاکہ آئینی خلا پیدا کیا جا سکے اور سیاسی نظام کے استحکام و تسلسل میں رکاوٹ ڈالی جا سکے۔ ایسے نازک حالات میں یہ انتخاب عمل میں آیا۔

خط: اگر ایسا واقعہ پیش آجاتا تو ملک کے لیے حضرت آقا کی شہادت سے بھی کہیں زیادہ سنگین مسائل پیدا ہو سکتے تھے؟

بالکل ایسا ہی ہے؛ یعنی یہ خطرہ موجود تھا۔ ان حالات میں دو بنیادی اقدامات کیے گئے: اول: مجلسِ خبرگان کے ارکان کو ہر قسم کے نقصان اور خطرے سے محفوظ رکھنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، کیونکہ مجلسِ خبرگان کے ارکان کی تعداد ۸۰ سے زائد ہے اور وہ ملک کے مختلف علاقوں میں منتشر تھے؛ لیکن دقیق انتظام اور بہترین حکمتِ عملی کے ذریعے یہ کام مکمل طور پر انجام دیا گیا۔ یعنی مجلسِ خبرگان کے ارکان کی حفاظت سو فیصد یقینی بنائی گئی۔

> «ہم نے مجلسِ خبرگان کے ارکان سے کہا کہ وہ چند دن قم میں قیام کریں، تاکہ جیسے ہی اجلاس کے انعقاد کے لیے حالات سازگار ہوں، وہ ہر لحہ تیار رہیں۔»

دوم: ارکان کو جمع کرنا اور رہبر کے انتخاب کے لیے اجلاس منعقد کرنا، وہ بھی عین قانونی ضوابط کے مطابق۔ ایسے غیر معمولی حالات میں، جب دشمن کی طرف سے خوف و ہراس پیدا کیا جا رہا ہو، ایک جلسہ تشکیل دینا اور پھر قانون کے مطابق انتخاب عمل میں لانا ایک بہت بڑا کام تھا۔ یہ عمل نصب کا نہیں تھا، بلکہ انتخاب تھا؛ یعنی تشخیص کا عمل۔ ایسی تشخیص جو پورے معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے انجام دی جاتی ہے۔

یہاں ایک فقہی بحث بھی موجود ہے، جس کی وضاحت عوام کے لیے ضروری ہے۔ جامع الشرائط فقیہ کی ولایتِ امر کے لیے نصب ائمۂ معصومین علیہم السلام اور حضرت ولیِ عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی جانب سے عمومی طور پر، فقہی اصطلاح میں قضیۂ حقیقیہ کے طور پر انجام دی گئی ہے۔ یعنی ہر وہ فقیہ جو ہمارے احکام سے واقف ہو، حاکم ہے: «مَن كَانَ مِنكُم مِمَّن قَدْ رَوَى حَدِيثَنَا وَنَظَرَ فِي حَلَالِنَا وَحَرَامِنَا وَعَرَفَ أَحْكَامَنَا، فَلْيَرْضَوْا بِهِ حَكَمًا، فَإِنِّي قَدْ جَعَلْتُهُ عَلَيْكُمْ حَاكِمًا۔»[1]

یہ جملہ معصوم علیہ السلام کی جانب سے صادر ہوا ہے۔ اسی طرح حضرت ولیِ امر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف سے بھی روایت ہے: «أَمَّا الْحَوَادِثُ الْوَاقِعَةُ فَارْجِعُوا فِيهَا إِلَى رُوَاةِ حَدِيثِنَا»[2] اور اس روایت کے بارے میں جو عمومی تفاسیر بیان کی گئی ہیں، ان کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے، یہ نصب امام کی جانب سے انجام پاتا ہے۔ البتہ یہ نصب ایک عمومی نصب ہے؛ یعنی ایسے شخص کی تقرری جو ان شرائط کا حامل ہو۔ اس مقام پر عوام کی ذمہ داری یہ ہے کہ اہلِ خبرہ کی طرف رجوع کریں؛ ایسے اہلِ خبرہ جو کسی شخص میں ان شرائط کی تشخیص کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں کہ آیا وہ شخص امامِ معصوم علیہ السلام کی جانب سے ولایتِ امر کے لیے منصوب ہونے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔ خبرگان ایسے افراد کی تلاش میں آتے ہیں اور ان تمام اشخاص کے بارے میں تحقیق و بررسی کرتے ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے ان شرائط کے حامل ہونے کے امیدوار سمجھے جاتے ہیں۔ شاید کئی سالوں کے دوران انہوں نے تحقیق کی، فہرستیں تیار کیں اور افراد کا جائزہ لیا۔ جب اس کام کی ضرورت

---

(۱) الکافی، جلد ۱، صفحہ ۶۷

(۲) کمال الدین و تمام النعمۃ، جلد ۲، صفحہ ۴۸۴

پیش آئی تو وہ پہلے ہی اپنی ذمہ داری انجام دے چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے آکر بتایا کہ ہم نے جائزہ لیا ہے اور مثلاً یہ چند افراد ان شرائط کے حامل ہوسکتے ہیں؛ البتہ انہوں نے ان میں کچھ ترجیحات بھی مقرر کی ہوئی تھیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مجلسِ خبرگان کے اراکین خود اپنی رائے دینے کا حق نہیں رکھتے؛ بلکہ وہ مخصوص کمیٹی میں اپنی رائے بھی پیش کرسکتے ہیں۔

خط: کیا وہ کمیٹی بھی مجلسِ خبرگان کے ارکان ہی پر مشتمل تھی؟

جی ہاں، وہ بھی مجلسِ خبرگان کے ارکان ہی تھے۔ اس کمیٹی کو اس لیے مقرر کیا گیا تھا تاکہ اس معاملے میں مزید باریک بینی اور دقت کے ساتھ جائزہ لیا جاسکے۔ ہم نے مجلسِ خبرگان میں یہ طریقہ اختیار کیا اور کہا کہ یہ مخصوص کمیٹی کی تجویز ہے۔ اگر مجلسِ خبرگان کے دیگر ارکان کے پاس بھی کوئی تجاویز ہیں تو وہ بھی پیش کریں۔ چنانچہ ہم نے تمام تجاویز کو، مخصوص کمیٹی کی تجویز کے ساتھ، رائے شماری کے لیے پیش کیا۔ چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ اگر اجلاس منعقد ہوا تو ہمارے پاس بحث کے لیے زیادہ وقت نہیں ہوگا، اس لیے ہم نے یہ تدبیر اختیار کی۔ ہم چاہتے تھے کہ مجلسِ خبرگان کے تمام ارکان کی آرا پہلے ہی حاصل کرلی جائیں۔ لہٰذا ہم نے کہا کہ اپنی تجاویز تحریری طور پر پیش کریں، تاکہ ہم ان تمام تجاویز کو جمع کرسکیں اور پھر جب اجلاس منعقد ہو تو کم سے کم وقت میں وہاں کسی نتیجے تک پہنچ سکیں۔ لہٰذا آپس میں، مجلسِ خبرگان کے ارکان کے درمیان، اپنے مباحث جاری رکھیں۔

یہ آٹھ روزہ مدت درحقیقت مجلسِ خبرگان کے ارکان کے لیے مختلف تجویز کردہ امیدواروں کے بارے میں مزید تلاش، بحث اور تحقیق کا موقع تھی۔ انہوں نے ان کے سابقہ، شرائط، علمی و تخصصی اہلیت اور صلاحیتوں کا جائزہ لیا۔ ہم نے خود بھی مجلسِ خبرگان کے ارکان سے کہا تھا کہ وہ چند روز کے لیے قم میں قیام کریں، تاکہ جیسے ہی اجلاس کے انعقاد کے لیے حالات سازگار ہوں اور انہیں طلب کیا جائے، وہ فوراً اجلاس کے لیے تیار ہوں۔

ان چند دنوں کے دوران جب یہ حضرات قم میں موجود تھے، مزید مشاورت اور تحقیق کے لیے بہت اچھا موقع میسر آیا۔ اسی وجہ سے جب اجلاس منعقد ہوا تو تمام ارکان امیدواروں کے بارے میں واضح سوچ اور مکمل بصیرت کے ساتھ آئے اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ حاج آقا مجتبیٰ خامنہ ای کو سب سے زیادہ تائید حاصل ہوئی اور دوسرے امیدواروں کے مقابلے میں ان کی رائے کا فرق بہت ہی نمایاں تھا۔

خط: ان صفات کے بارے میں فرمایئے جو آئینِ اساسی کے مطابق رہبر کے لیے ضروری ہیں، اور یہ صفات حضرت آیت اللہ آقا سید مجتبیٰ خامنہ ای میں کس حد تک پائی جاتی ہیں؟

دیکھیے، اصولاً حوزۂ علمیہ میں جو نمایاں شخصیات فطری طور پر فضلا اور طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرسکتی ہیں، وہ معتبر اور پرجوش علمی حلقۂ درس بھی قائم کرسکتی ہیں، پرجوش درس قائم کرسکتی ہیں، یوں ان کی تمام علمی جہات رفتہ رفتہ پوری طرح واضح ہوجاتی ہیں۔ حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای تقریباً تیس سال، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ عرصے تک حوزۂ علمیہ قم سے وابستہ رہے؛ کبھی طالبِ علم کی حیثیت سے اور کبھی تدریس کے میدان میں۔ وہ حوزۂ علمیہ قم میں ایک معروف شخصیت تھے۔ ان کا علمی حلقۂ درس معتبر بھی تھا اور نہایت پرجوش بھی۔

قم اور ہمارے حوزہ ہائے علمیہ میں کسی شخص کے لیے اتنی آسانی سے ایک استاد کی حیثیت سے مقام بنانا اور طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنا ممکن نہیں ہوتا؛ کیونکہ یہاں ایک بالکل فطری علمی مسابقت موجود ہوتی ہے اور طالبِ علم کو آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنے استاد کا انتخاب خود کرے۔ جب کوئی شخص ایسے علمی ماحول میں

بڑی تعداد میں فضلا اور طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو یہ بذاتِ خود اس بات کی علامت ہے کہ وہ بلند علمی مقام اور گہری علمی صلاحیت رکھتا ہے۔ حاج آقا مجتبیٰ ان تیس سے زائد سالوں کے دوران، جب حوزہ علمیہ میں رہے، ایک معروف علمی شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے اور سب ان کے فضل اور علمی مقام کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ، حوزۂ علمیہ قم کے متعدد ممتاز علما اور اعلیٰ درجے کے مجتہدین نے خود مجلسِ خبرگان کے اسی اجلاس میں صراحت کے ساتھ ان کی علمی صلاحیت کی گواہی دی۔ اس سے پہلے بھی جب ہم نے ان سے اس بارے میں سوال کیا تھا، تو وہ ان کی علمی قابلیت کی گواہی دے چکے تھے۔ لہٰذا ان کا علمی مقام نہایت مضبوط اور معتبر ہے اور الحمدللہ، فقہی مسائل میں وہ ایک مسلم اور ثابت شدہ مجتہد ہیں۔ اس علمی صلاحیت کے ساتھ ساتھ ملک کے حالات پر ان کی گہری گرفت اور واقفیت بھی نہایت اہم ہے۔

بہرحال، حضرت آقا کی قیادت کے پورے دور میں وہ مقامِ معظمِ رہبری کے سایے میں رہے اور ان کے ساتھ قریبی طور پر کام کرتے رہے۔

خط: کیا آپ یہ باتیں اپنے مشاہدے اور واقفیت کی بنیاد پر فرما رہے ہیں؟

جی ہاں۔ وہ انتظامی امور اور انتظامی فیصلہ سازی کے بہت سے میدانوں میں مکمل طور پر آقا کے ساتھ رہے ہیں۔ اس لیے انہیں نہ صرف آقا کے طرزِ مدیریت اور انتظامی طریقۂ کار کا بخوبی علم ہے، بلکہ ان کے زیرِ نگرانی آنے والے مختلف انتظامی شعبوں سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں۔

انہیں ملک کے حالات، فوج، سپاہِ پاسداران اور مجموعی طور پر مسلح افواج کے بارے میں بھی بہت اچھی واقفیت حاصل ہے۔ اسی طرح مختلف اداروں کے انتظامی شعبوں، اقتصادی، سماجی اور سیاسی میدانوں کے بارے میں بھی ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ بہت سے مواقع پر خود مقامِ معظمِ رہبری شہید انہیں ذمہ داری سونپتے تھے کہ وہ جاکر امور کی پیروی کریں اور اپنی رائے پیش کریں۔ بعض اوقات ہمیں بھی یہ مشورہ دیا جاتا تھا کہ ملک کے بعض مسائل میں جناب مجتبیٰ سے رجوع کریں۔

میری مراد یہ ہے کہ اس اعتبار سے ان کی صلاحیتیں بالکل اطمینان بخش تھیں؛ چاہے ان کی علمی اور فقہی صلاحیت ہو، ملک کے حالات پر ان کی گہری نظر ہو، فوجی و عسکری مسائل سے واقفیت ہو، اقتصادی مسائل کا علم ہو یا مختلف میدانوں میں انتظامی صلاحیت ہو۔ حتیٰ کہ سائنسی ترقی اور ملک میں علمی پیش رفت کے مختلف شعبوں سے بھی ان کی واقفیت بہت وسیع ہے۔

مجموعی طور پر مجلسِ خبرگان میں جو انتخاب عمل میں آیا، وہ ایک نہایت پختہ انتخاب تھا؛ ایسا انتخاب جو شناخت، تحقیق، دقتِ نظر اور ایک جامع جائزے کی بنیاد پر کیا گیا۔ میں خود مجلسِ خبرگان کے ایک رکن کی حیثیت سے، دوسرے اراکین کی طرح، تحقیق کرتا رہا، تلاش و جستجو کی اور مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا؛ اس دوران شرعی اور قانونی معیار کے علاوہ کسی اور چیز کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ حقیقتاً ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ اصلح ترین فرد، یعنی سب سے زیادہ موزوں اور اہل شخص، وہی ہیں۔ مجلسِ خبرگان کے تمام ارکان مجتہد اور سیاست سے واقف علما ہیں۔ ان میں سے بہت سے حضرات واقعی طویل عرصے تک انتظامی ذمہ داریاں نبھانے اور مختلف میدانوں میں کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس طویل انتظامی تجربہ تھا، ان کی فقہی بصیرت بھی بہت بلند تھی؛ وہ فقیہ تھے، سیاست دان تھے، معاشرے کو جانتے تھے اور عملی میدان میں کام کر چکے تھے۔ ان سب کی رائے حضرت آیت اللہ آقای مجتبیٰ خامنہ ای کے حق میں تھی۔ ان کی فقاہت کا بھی نہایت احتیاط کے

ساتھ مکمل جائزہ لیا گیا۔ انتہائی سنجیدگی اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ان کے اجتہاد، تدبیر، زہد، تقویٰ اور دیگر صلاحیتوں کا جائزہ لیا گیا۔ جمہوری اسلامی جیسے نظام کی قیادت کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، کیونکہ اس کے سامنے نہایت سنگین تحدیات موجود ہیں۔ ہم نہ صرف آیت اللہ آقای مجتبیٰ خامنہ ای کو جانتے تھے، بلکہ ہمیں یہ بھی پوری طرح معلوم تھا کہ جو بار ان کے کندھوں پر رکھا جانے والا ہے، وہ کس قدر بھاری ذمہ داری ہے۔

لہٰذا یہ فیصلہ آنکھیں بند کر کے نہیں کیا گیا؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ پوری بصیرت، مکمل تحقیق اور کھلی آنکھوں کے ساتھ کیا گیا۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ خامنہ ای، ہمارے عظیم اور عزیز شہید، نے اسی کمیٹی، یعنی آئین کے اصول ۱۰۷ اور ۱۰۹ کے تحت رہبری کے لیے افراد کی اہلیت کی تشخیص کی ذمہ دار کمیٹی، کے جواب میں ایک بیان فرمایا تھا۔ جب اس کمیٹی کے ارکان کئی مرتبہ ہمارے شہید رہبر کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے درخواست کی کہ اگر آپ کی کوئی رائے ہو، خواہ کسی اشارے، کنائے یا کسی بھی انداز میں، جس سے ہم مستقبل میں استفادہ کر سکیں، تو براہِ کرم بیان فرما دیں۔ لیکن آپ سو فیصد اس بات سے گریز فرماتے رہے کہ کوئی ایسی بات کہیں۔ پھر آپ نے فرمایا: یہ کام خدا کا کام ہے، اور جس دن ضرورت ہوگی، خدا دلوں کو اسی سمت ہدایت دے گا جہاں انہیں جانا چاہیے۔

یہ خود ہمارے شہید امام کے الفاظ تھے کہ: جس دن ضرورت ہوگی، خدا دلوں کو اسی مقام کی طرف ہدایت دے گا جہاں انہیں جانا چاہیے۔ ہم نے اس حقیقت کو اپنے پورے وجود کے ساتھ محسوس کیا کہ واقعی خدا نے دلوں کو آیت اللہ سید مجتبیٰ کی طرف ہدایت دی اور ان کے انتخاب پر دلوں کو یکجا کر دیا۔ مجلسِ خبرگان میں جو وحدتِ کلمہ پیدا ہوئی، عوام نے جس طرح حقیقی طور پر اپنی قبولیت کا اظہار کیا، آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب پر لوگوں میں جو خوشی و مسرت پیدا ہوئی، اور یہ کہ ان کے انتخاب کے ساتھ ہی وہ کتنی تیزی سے ایک مستحکم اور باصلاحیت رہنما کے طور پر اپنی جگہ بنا گئے، فوراً اپنی ذمہ داریاں سنبھالیں اور میدانِ عمل میں اتر آئے — یہ سب ایسے واقعات نہیں ہیں جنہیں معمولی اور عام سمجھا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ اس معاملے کے پسِ پردہ امام زمانہ ﷺ کا دستِ عنایت کارفرما ہے۔ اگر کسی کو اب تک اس بات میں شک تھا کہ امام زمانہ ﷺ اس نظام کے پشت پناہ ہیں، تو ان واقعات کے بعد جو کچھ پیش آیا — آیت اللہ خامنہ ای کی شہادت سے لے کر آیت اللہ مجتبیٰ خامنہ ای کے انتخاب تک اور اس کے بعد کے واقعات تک — اس نے اسے سمجھا دیا کہ یہ سب امام زمانہ ﷺ کی عنایت سے ہے۔ جنگ کے حالات میں، اور ان تمام مشکلات کے باوجود جن کا عوام کو سامنا تھا اور اب بھی ہے، لوگوں کے دلوں کا اس طرح ایک ہو جانا، اسی الٰہی ہدایت کی نشانی ہے۔ ہم نے امام زمانہ ﷺ کے دستِ عنایت کو پوشیدہ نہیں بلکہ آشکارا دیکھا ہے۔

مرحوم محقق نائینی کے نواسے ہمارے لیے نقل کیا کرتے تھے کہ جس زمانے میں روسی فوجیں ملک میں داخل ہوئی تھیں، وہ اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے بارے میں بہت پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے خواب میں حضرت ولیِ عصر ﷺ کی زیارت کی۔ حضرت ﷺ نے ایک دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: « یہ دیوار، جو ایران کی دیوار ہے، ہم اسے محفوظ رکھیں گے؛ آپ فکر نہ کریں۔ »

حقیقت بھی یہی ہے؛ امام زمانہ ﷺ اسے محفوظ رکھ رہے ہیں۔ ہمیں اس نعمت پر شکر گزار ہونا چاہیے کہ الحمدللہ، خداوندِ متعال نے دلوں کو ایک ہی سمت رواں کر دیا ہے۔

خط: گفتگو کے اختتام پر اگر آیت اللہ آقا سید مجتبیٰ خامنہ ای، رہبرِ معظم انقلاب، کے خطاب میں کوئی بات فرمانا چاہتے ہیں تو ارشاد فرمائیں تاکہ ہم اسے شامل کر سکیں۔

جی ہاں، میں اپنے عزیز رہبر، حضرت آیت اللہ حاج آقا مجتبیٰ خامنہ ای کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ہم آپ کی اطاعت کو اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں اور شرعاً آپ کو اپنا ولیِ امر مانتے ہیں۔ آپ جن جن میدانوں میں بھی حکم فرمائیں گے، ہم اسے ایک شرعی ولیِ امر کی جانب سے صادر ہونے والے امر کے طور پر، ایسے ولیِ امری کے حکم کے طور پر جو صاحب الامر کی جانب سے منصوب ہے، اور امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے نائبِ مطلق کی حیثیت سے، آپ کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھیں گے۔ ہم آپ کے امر کو امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا امر اور آپ کے فرمان کو امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا فرمان سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ روایت میں آیا ہے: «الراد علیہم کالراد علینا والراد علینا کالراد علی اللہ»؛ جو شخص ولیِ امر کے فرمان سے سرپیچی کرے، گویا اس نے امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے فرمان سے سرپیچی کی ہے، بالکل اس شخص کی مانند جو امیر المؤمنین علیہ السلام اور سید الشہداء علیہ السلام کے فرمان سے سرپیچی کرے۔ ہم آپ کے امر کو اپنے اوپر امیر المؤمنین علیہ السلام کے امر کی مانند نافذ اور جاری سمجھتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ خداوندِ متعال آپ کو اپنی پناہ میں محفوظ رکھے اور آپ جو بھی فیصلہ فرمائیں، اس میں عنایتِ الٰہی اور توجہِ امام زمانہ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف آپ کے ساتھ ہو۔

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آخرت پر توجہ، سعادت کا عمومی راستہ

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

بہت سے مؤمنین مبدأ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی ربوبیت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن زیادہ تر لوگ آخرت پر توجہ کے ذریعے سعادت تک پہنچتے ہیں۔ توحید اور اللہ تعالیٰ کی صفات پر غور سے بہت کم لوگ اس مقام تک پہنچ پاتے ہیں۔ آخرت پر توجہ دراصل «تقویٰ» ہی کی ایک دوسری تعبیر ہے۔ یعنی انسان کو چاہیے کہ آخرت، قیامت کے برپا ہونے اور اپنے اعمال کے حساب و کتاب کی طرف متوجہ رہے، تاکہ اس کے اندر پرہیزگاری اور تقوائے الٰہی پیدا ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ اور ائمۂ معصومین علیہم السلام ہمیشہ قیامت کو یاد رکھتے تھے، کیونکہ آخرت کی طرف توجہ کرنا ایک الٰہی حکم اور مطلوب امر ہے۔

۱۴/ نومبر ۲۰۱۸



منطقِ انتخاب

آیت اللہ عبداللہ کیوانی ہفشجانی

یادداشت

اسلامی انقلاب کی قیادت کے لیے آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کے انتخاب کی روداد، آیت اللہ عبداللہ کیوانی کی زبانی
(مجلس خبرگان رہبری میں صوبہ چہارمحال و بختیاری کے نمائندے)

● آٹھ سخت دن

میں ان آٹھ دنوں کے بارے میں، جو امتِ اسلامی پر بہت بھاری گزرے، ایک مختصر روداد عرض کرتا ہوں۔

پہلا نکتہ: عوامی افکار میں رہبری کے لیے اصلح اور اعلم امیدوار کی طرف جو غیر معمولی رجحان پیدا ہوا، وہ قابلِ توجہ ہے۔ میں اپنے بعض دوستوں سے پوچھتا تھا: کیا آپ نے کبھی آقا سید مجتبیٰ کو قریب سے دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں! کیا آپ نے ان کی تقریر سنی ہے؟ کہا: نہیں! کیا آپ نے ان کی آواز یا تصویر دیکھی ہے؟ کہا: نہیں! کیا ان کا کوئی انٹرویو نشر ہوا ہے؟ نہیں! کیا اس سے پہلے اسلامی جمہوریہ ایران کے ذرائع ابلاغ نے ان کی تشہیر یا تعارف کرایا تھا؟ نہیں! کیا ٹیلی ویژن نے ان کے بارے میں کوئی پروگرام یا فلم نشر کی تھی؟ نہیں! کیا رہبرِ معظمِ انقلاب، قائدِ شہید، نے کبھی عوام کے سامنے ان کے بارے میں کوئی بات فرمائی تھی؟ نہیں کیا مثلاً حکومتی عہدیداروں، مجلس یا کسی اور مقام پر کسی نے ان کی تشہیر کی تھی؟ بالکل نہیں! بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا؛ دشمن نے تو جتنا ممکن تھا، ان کی کردار کشی اور تخریب کی! تو پھر یہ کیا چیز تھی کہ عوام کو ان کی طرف اس قدر توجہ حاصل ہوئی اور ان کے دل و دماغ اس محترم شخصیت کی طرف راغب ہو گئے؟ یہ حضرت بقیۃ اللہ ﷺ کی عنایت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ واقعی یہ ایک نہایت عجیب عنایت ہے!

دوسرا نکتہ: مجلسِ خبرگان کے ارکان ہیں، جو مجتہدین ہیں۔ ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اور اپنے پروردگار کے درمیان اپنے ہر اقدام کے لیے شرعی دلیل اور حجت رکھتے ہوں۔ اس کے علاوہ، جس شخص کو وہ منتخب کریں، اس کے بارے میں ظاہری تحقیقات کی بنیاد پر یہ بھی ثابت ہونا چاہیے کہ حکمرانی کے لیے اس سے بہتر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ کیونکہ اگر اس سے بہتر کوئی موجود ہو تو نہ شرعاً وہ شخص یہ ذمہ داری قبول کرنے کا مجاز ہے، اور نہ ہی خبرگان کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے منتخب کر کے یہ ذمہ داری تفویض کریں۔ ان آٹھ دنوں میں رہبری کے خلا کے علاوہ ہمیں ایک اور بحران کا بھی سامنا تھا؛ اور وہ یہ تھا کہ مجلسِ خبرگان کے تمام ارکان خود دشمن کا ہدف تھے۔ کیونکہ دشمن نے اپنے تجزیوں میں یہ کہا تھا کہ اگر ہم رہبر کو نشانہ بنا دیں اور خبرگان باقی رہیں، تو یہ لوگ پھر بھی جا کر نیا رہبر منتخب کر لیں گے۔ ان آٹھ دنوں کے دوران مجلسِ خبرگان کے ارکان نے متعدد چھوٹے چھوٹے اجلاس منعقد کیے۔ یعنی دو افراد کے اجلاس سے لے کر پانچ، چھ افراد؛ پھر دس، پندرہ افراد؛ اور بیس، تیس افراد تک کے اجتماعات ہوئے، اور ان میں رہبر کے انتخاب کے موضوع پر مسلسل غور و خوض اور گفت و شنید جاری رہی۔

ان آٹھ دنوں میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ عنایت فرمائی کہ انہی ابتدائی دنوں میں مجلسِ خبرگان کے ارکان کے اذہان اس جانب

راغب ہوگئے۔ چنانچہ پہلے ہی دو، تین دن کے اندر خبرگان کے تقریباً تیس، چالیس ارکان نے آیت اللہ سید مجتبیٰ کو رہبر کے طور پر انتخاب کے لیے زیرِ غور امیدواروں میں شامل کیا۔

حجتِ خبرگان

ان متعدد چند نفری نشستوں میں ہم نے مختلف امیدواروں کی شرائط اور اوصاف کا جائزہ لیا۔ ان میں سے چند خصوصیات آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں:

- **۱۔ اجتہاد**

حاج آقا مجتبیٰ کے اجتہاد کے بارے میں چند شواہد ایسے تھے جنہوں نے ہمیں اس نتیجے تک پہنچایا۔ پہلی بات یہ کہ انہوں نے حوزۂ علمیہ قم میں تقریباً پندرہ سال فقہ واصول کے درسِ خارج میں تدریس کی، اور ان کا درس حوزہ کے سب سے زیادہ پُررونق اور کثیر الطلبہ دروس میں شمار ہوتا تھا۔ جو شخص درسِ خارج دیتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود مجتہد ہو، تاکہ اس کے درس میں شریک ہونے والے طلبہ اس کے ذریعے اجتہاد کا طریقۂ کار سیکھ سکیں۔ دوسری دلیل یہ تھی کہ مجلسِ خبرگان کے بعض ارکان نے گواہی دی کہ ہم نے خود ان کے ساتھ علمی مباحثہ کیا، علمی گفتگو کی اور ان کے اندر شرعی احکام کے استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت و قوت کو قریب سے دیکھا ہے۔ تیسری دلیل رہبرِ شہید کی جانب سے حاج آقا مجتبیٰ کو یہ ہدایت تھی کہ وہ سید یزدی کی معروف کتاب «العروۃ الوثقیٰ» پر حاشیہ تحریر کریں۔ جس شخص کا مجتہد ہونا ثابت اور مسلم ہوجائے اور اس بات کا امکان ہو کہ لوگ دینی مسائل میں اس کی طرف رجوع کریں گے اور اس سے رسالۂ عملیہ طلب کریں گے، وہ «العروۃ الوثقیٰ» پر حاشیہ تحریر کرتا ہے، اور اسی حاشیے کی بنیاد پر اس کا رسالۂ عملیہ مرتب کیا جاتا ہے۔ «العروۃ الوثقیٰ» پر حاشیہ لکھنا ایک مجتہدِ جامع الشرائط کا کام ہے، اور یہ بھی آقا مجتبیٰ کے اجتہاد کی ایک دلیل تھی۔

چوتھی دلیل بعض مراجعِ عظام کی حمایت تھی۔ بعض مراجع نے مجلسِ خبرگان کی مجلسِ عاملہ سے رابطہ کیا اور فرمایا کہ رہبر کے انتخاب کے عمل میں تیای لائی جائے اور ہماری رائے یہ ہے کہ حاج آقا مجتبیٰ کو منتخب کیا جائے۔ لہٰذا آقا مجتبیٰ کا اجتہاد، علمی مقام اور فقہی واستنباطی صلاحیت مجلسِ خبرگان کے ارکان کے لیے پوری طرح واضح اور ثابت ہوگئی۔

- **۲۔ زہد، مالی تقویٰ اور استکبار ستیزی**

فقیہِ جامع الشرائط کی ولایت کے تحفظ سے متعلق کمیٹی کے ارکان جب آقا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ حضرت آقا کسی مخصوص شخصیت کے بارے میں اپنی رائے بیان فرمائیں۔ آقا نے فرمایا: «میں معیار بتاتا ہوں؛ دو معیار بہت اہم ہیں: ایک مالی تقویٰ اور زہد، اور دوسرا استکبار ستیزی۔»

حضرت امام اور حضرت آقا کی فضیلت و کمالات میں شجاعت کا وصف بہت نمایاں ہے۔ میرے خیال میں جس چیز نے ہمیں نجات دلائی، استکبار کو ایران سے باہر نکالا اور ہمارے انقلاب کو کامیابی سے ہمکنار کیا، وہ امام اور حضرت آقا کا بے خوف ہونا تھا۔ استکبار مخالفت ایک پہلو سے شجاعت کا تقاضا ہے اور دوسرے پہلو سے دشمن کی صحیح شناخت کا۔

امریکا اور یورپی ممالک میں «استشراق»[1] کے متعدد مراکز موجود ہیں۔ شاید خود امریکا میں ہی «استشراق» کے بیس، تیس سے زیادہ تحقیقی مراکز موجود ہیں۔ وہ ایران اور مشرق کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں؛ یہ جاننے کے لیے کہ معدنی ذخائر کہاں ہیں،

---

(۱) استشراق: شرق شناسی، یعنی مشرق اور اسلامی مشرق کے بارے میں مغربی علمی وتحقیقی مطالعات

یورینیم، چاندی، سونا، عقیق اور دیگر مادی وسائل کہاں موجود ہیں؛ اور یہ بھی کہ شیعی عرفان یا شیعی فلسفے کے حوالے سے کیا خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ استشراق کا مطلب یہی ہے کہ وہ ہماری زندگی، ہمارے معاشرے اور ہماری فکر کے ایک ایک پہلو اور اس کے نشیب و فراز کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن کیا ہمارے ہاں «استغراب»(۱) بھی موجود ہے؟

آج کے دور میں شاید علمائے شیعۂ امامیہ کے درمیان مغرب شناسی کے ایسے محققین کی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں سے بھی زیادہ نہ ہو، جو مغرب کو گہرائی سے جانتے ہوں۔ ان میں حاج آقا مجتبیٰ مغرب شناسی کے میدان میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مغرب کو بخوبی جانتے ہیں، مغرب کے بارے میں باقاعدہ تحقیقات بھی کی ہیں اور اس میدان میں بے نظیر شخصیات میں شمار ہوتے ہیں۔

میرے ایک دوست بتا رہے تھے کہ ایک نشست میں امریکا کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اس موقع پر حاج آقا نے امریکا کے پہلے صدر سے لے کر موجودہ صدر تک، ہر ایک کے طرزِ حکمرانی، امریکا کے لیے کیے گئے اقدامات، اور ان صدور کی قوتوں اور کمزوریوں کو یکے بعد دیگرے بیان کرنا شروع کر دیا۔ مغرب کے مسائل پر ان کی گرفت اور واقفیت اس قدر گہری ہے کہ گویا انہوں نے پیرس اور لندن کی گلی کوچوں میں زندگی گزاری ہو۔

- **۳۔ جنگی امور سے واقفیت**

ان تمام خصوصیات سے بھی زیادہ اہم مسئلہ سپریم کمانڈر کی حیثیت سے مسلح افواج کی قیادت ہے۔ قائدِ شہید اس خصوصیت کے اعتبار سے بے نظیر تھے۔ دینی علما میں جو لوگ ان امور سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، ان میں شاید سید حسن نصر اللہ اور سید صفی الدین جیسی شخصیات بہت کم ہوں۔ اب سید حسن نصر اللہ اور شہید صفی الدین نے یہ امور کہاں سے سیکھے تھے؟ ایران میں۔ اور ان تعلیمات و تجربات کے حصول میں ان کے ساتھ کون تھا اور کس نے ان کے ساتھ مل کر یہ امور سیکھے؟ حاج آقا مجتبیٰ۔

جناب رحیم صفوی بیان کرتے تھے کہ ہم فوجی کمانڈروں کی ایک نشست میں موجود تھے۔ وہاں ایک فوجی معاملے پر گفتگو ہوئی۔ حاج آقا مجتبیٰ کھڑے ہوئے اور اپنی رائے پیش کی۔ ان کی بات اس قدر فنی اور دقیق تھی کہ تین مرتبہ اسے تختۂ تحریر پر لکھا گیا اور پھر مٹا دیا گیا۔ وہاں موجود تمام فوجی کمانڈروں نے فوجی امور کے بارے میں ان کی رائے کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا۔ وہ فوجی اور دفاعی امور پر مکمل عبور اور گہری دسترس رکھتے ہیں۔ وہ تقریباً تیس سال تک حضرت آقا کے حکمرانیِ اسلامی کے امور میں خصوصی معاون رہے، بالخصوص فوجی اور دفاعی معاملات میں۔ لہٰذا وہ ایک تجربہ کار، پختہ کار اور فوجی امور پر مکمل دسترس رکھنے والی شخصیت ہیں۔

حتمی فیصلہ

یہ تمام مباحث مجلسِ خبرگان میں زیرِ بحث آئے، ان پر غور و خوض ہوا اور آخرکار یہ نتیجہ سامنے آیا۔ اگرچہ اس دوران نشانہ بنائے جانے کا خطرہ بھی موجود تھا، لیکن الحمدللہ ماہ مبارک کی انیسویں شب ہم نے اجلاس منعقد کیا۔ ان تمام مباحث کو پیش کیا گیا، غور و خوض کے بعد حتمی نتیجہ کیا گیا اور پھر رائے شماری عمل میں آئی۔ حتمی فیصلہ مرتب کرنے میں ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت لگا۔ اس کے بعد رائے شماری ہوئی؛ پہلے قیام و قعود کے ذریعے اور سب سے اہم یہ کہ تحریری رائے شماری بھی کی گئی۔ مجلسِ خبرگان کی تقریباً تمام اکثریت نے آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کو رہبر منصوب کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ بھی دوسری بڑی برکت تھی۔ جو افراد ووٹ کے لیے نہ آ سکے، ان کی تعداد دس سے بھی کم تھی۔

---

(۱) استغراب: غرب شناسی، یعنی مغرب، اس کے افکار، تہذیب، تاریخ اور نظاموں کا گہرا مطالعہ اور شناخت



ایک صاحب کہہ رہے تھے: "اب جب آپ حاج آقا مجتبیٰ کو امیدوار کے طور پر پیش کر رہے ہیں، تو شاید وہ خود اس پر راضی نہ ہوں۔" میں نے کہا: "یہ اب ان کے اختیار میں نہیں کہ وہ قبول نہ کریں۔ کیا ان کے مکرم والد، جنہیں حضرت امام کے بعد مجلسِ خبرگان نے رہبر منتخب کیا تھا، اس ذمہ داری پر راضی تھے؟" جب مجلسِ خبرگان کسی فیصلے تک پہنچ جائے اور کسی شخص کی رہبری پر متفق ہو جائیں، تو قانونی اور شرعی طور پر اس شخص کے لیے مخالفت کی گنجائش نہیں رہتی۔ بلکہ ہماری نظر میں تو جو شخص اس منصب کا خواہش مند نہ ہو، بلکہ اس سے گریز کرے، وہ زیادہ ترجیح کا مستحق ہے؛ اور ایسے ہی شخص کو یہ ذمہ داری سونپی جانی چاہیے۔ لہٰذا ہم نے انہیں اجلاس میں مدعو نہیں کیا اور اپنا فیصلہ کر لیا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آقا مجتبیٰ کو مجلسِ خبرگان کے اعلامیے کے مطابق، ٹیلی ویژن کے ذریعے ہی اپنے انتخاب کی اطلاع ہوئی۔



امت کی قدر



استاد محمد تقی فیاض بخش

گفتگو

ان ایام میں انقلاب کے نئے رہبر کے ساتھ ہونے والی بیعتوں کی مناسبت سے، میں نے ضروری سمجھا کہ رفقا سے ایک ایسی بات عرض کروں جو سلوکِ الی اللہ کے اعتبار سے ہم سب کے لیے نہایت رہنمائی بخش اور مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ سورۂ انبیا میں اپنے متعدد انبیا کا ذکر فرمانے کے بعد ہمارے لیے ایک نہایت اہم قاعدہ بیان فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جن انبیا کا ہم نے تم سے ذکر کیا، ﴿أَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ﴾[1]؛ یعنی ہم نے ان کی زندگی کے ہر لمحے کو اپنی سرپرستی میں رکھا اور انہیں اعمالِ خیر کی طرف الہام کیا۔

مرحوم علامہ طباطبائی اس آیت کے ذیل میں بیان فرماتے ہیں کہ اس ارشادِ الٰہی سے مراد صرف وحیِ تشریعی اور آسمانی کتابوں کا نزول نہیں، بلکہ نیکی کے اعمال کی طرف ایک باطنی رہنمائی بھی ہے؛ ایسی باطنی رہنمائی جو انہیں ایک قوتِ الٰہی سے حمایت کرتی ہے، تاکہ وہ اعمالِ خیر، اقامۂ نماز اور ادائے زکوٰۃ کی طرف دعوت دیں۔ آیتِ کریمہ میں مراد اللہ کے وہ خاص بندے اور الٰہی رہنما ہیں جو مؤمنین کے ایک گروہ کی سرپرستی اپنے ذمے رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی بے سہارا نہیں چھوڑتا بلکہ اعمالِ نیک کی طرف ان کے دل میں الہام فرماتا ہے۔

کبھی رہبر، عصمتِ الٰہی کے اعتبار سے معصوم ہوتا ہے، جیسے انبیاؑ، جن کا مقام پروردگار کے نزدیک بالکل واضح ہے۔ اور کبھی ولیِ امر اپنے تقویٰ کی وجہ سے بارگاہِ خداوندی میں قدر و منزلت حاصل کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی حمایت و حفاظت کے سائے میں لے لیتا ہے: ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى، وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى، فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى﴾[2]

یہ اللہ تعالیٰ کا ایک الٰہی اصول ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے، صاحبِ سخاوت ہو اور ساتھ ہی توحید و ولایت پر ایمان رکھتا ہو، اللہ تعالیٰ یقیناً اس کی زندگی میں راستہ اس کے لیے روشن فرما دیتا ہے۔ ہمیں اس میں کوئی شک نہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے یہ ضمانت فرمائی ہے کہ خیرِ امت، صلاح اور درست راستے کی رہنمائی ان رہنماؤں کے دلوں میں الہام فرمائے گا جو انبیا کے جانشین اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہیں اور امت کے لیے ان کا راستہ روشن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات رہبر کے تقویٰ کے ساتھ ساتھ، اللہ تعالیٰ اپنی رعیت کے ساتھ رحمت اور محبت کی بنا پر بھی امت کی ہدایت اور خیر کا راستہ اس کے رہبر کے دل میں القا فرماتا ہے۔ لہٰذا یہ آیت ہمارے سامنے ایک عمومی قاعدہ بیان کرتی ہے۔ یہ قاعدہ سب سے چھوٹی

---

(۱) سورۂ مبارکہ انبیا، آیت ۷۳

(۲) سورۂ مبارکہ لیل، آیات ۵ تا ۷

اجتماعی اکائی، یعنی خاندان سے لے کر بڑے بڑے معاشروں اور پھر امت کی قیادت تک محیط ہے۔

ایک لڑکا اور لڑکی جب تک شادی نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان کے تقویٰ کی مقدار کے مطابق ان کی تربیت فرماتا ہے؛ مثلاً انہیں گناہ کے مواقع میں مبتلا نہیں ہونے دیتا اور حساس مواقع پر ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ لیکن جب وہ ازدواجی زندگی اختیار کرتے ہیں اور خاندان میں اولاد داخل ہوتی ہے، تو حساس مواقع پر، اگر وہ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہوں، اللہ تعالیٰ اولاد کی تربیت کے راستے میں بھی ان کی دستگیری فرماتا ہے اور انہیں الٰہی ہدایت اور الہامات سے بہرہ مند کرتا ہے؛ اگرچہ ممکن ہے کہ خود انہیں بھی اس بات کا احساس نہ ہو۔

یہی معاملہ استاد کے بارے میں بھی صادق آتا ہے۔ مرحوم استاد مطہری فرمایا کرتے تھے: کبھی کبھی میں اپنے مطالعے کے دوران کسی ایسے مسئلے سے دوچار ہوتا تھا جو میرے لیے حل نہیں ہوتا تھا؛ جتنا غور و فکر اور مطالعہ کرتا، وہ مسئلہ حل نہ ہوتا۔ پھر وہ فرماتے تھے کہ جب پروردگار کے وعدے پر کامل اطمینان رکھتے ہوئے اس مسئلے کو کلاس یا کسی مجلسِ سخن میں بیان کرتا، تو دیکھتا کہ وہ مسئلہ میرے لیے حل ہو گیا ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں اس قابل نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے لیے اس مسئلے کو حل فرمائے، بلکہ میرے مخاطبین اس کے قابل تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ اپنے مخاطبین پر رحمت کی وجہ سے مجھ پر بھی رحمت فرماتا تھا۔

پس امت پر لازم ہے کہ توحید، تزکیہ اور تہذیبِ نفس کی راہ پر ثابت قدم رکھ کر نزولِ برکات اور رحمت ہای الٰہی کے لیے زمینہ فراہم کرے اور اپنے رہبر کی ہدایتِ امور میں دستگیری کرے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے عزیز رہبر، جو ہمارے شہید رہبر کے خلفِ صالح ہیں، انہیں اپنی خصوصی ترین سرپرستی، ہدایت اور عنایات کے زیرِ سایہ قرار دے اور انہیں امت کی اصلاح اور پائیداری کا راستہ الہام فرمائے۔ بالخصوص انہیں اس امر میں مدد عطا فرمائے کہ وہ اس پُرآشوب دور میں، اس طوفان زدہ کشتی کو اکبر شیاطین کے مقابلے میں ساحلِ نجات تک پہنچا سکیں۔

موت پر غور و فکر

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

قرآنِ کریم میں جہنم سے متعلق بحث کرنے والی آیات، جنت کے بارے میں بیان والی آیات سے زیادہ ہیں۔ اگرچہ شاید قرآن میں لفظ جنت اور جہنم تقریباً ایک ہی تعداد میں آئے ہوں، لیکن مجموعی طور پر قرآنِ کریم میں وعید اور عذاب، وعدوں اور رحمتوں کے مقابلے میں زیادہ بیان ہوئے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمارے سامنے ایک ایسا منظر قرار دینا چاہا ہے جس سے ہم ہر وقت غور و فکر میں رہیں۔ اس میں داخلے کا ایک اہم ذریعہ موت میں غور و فکر کرنا ہے۔ موت کو یاد کرنا اور اس کے بارے میں تفکر کرنا، زندگی کی بہت سی غیر ضروری چیزوں کو انسان سے دور کر دیتا ہے۔ مثلاً نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس طرح نماز پڑھو گویا یہ تمہاری آخری نماز ہے۔

۱۰ جنوری ۲۰۱۸ء



قوموں کی بعثت

حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ حسین معتوق

انٹرویو

آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی قیادت کے عالمی اوصاف؛ حجۃ الاسلام والمسلمین شیخ حسین معتوق سے گفتگو میں، جو مجمعِ جہانی اہلِ بیت کے رکن اور کویت کے علماء و مجاہدین میں سے ہیں۔

خط: حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای سے اپنی شناسائی اور واقفیت کے بارے میں فرمایئے۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ میرا ان کے ساتھ براہِ راست کوئی رابطہ نہیں رہا، البتہ میں ان لوگوں کے ساتھ رابطے میں رہا ہوں جو ان سے وابستہ تھے، اور ان کی علمی مباحث اور علمی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتا ہوں۔

جب امام خامنہ ای شہید ہوئے تو ہم سب، یعنی میں اور میرے وہ بہت سے بھائی جنہیں میں جانتا ہوں، خواہ وہ برادرانِ مزاحمت میں سے ہوں یا ان کے علاوہ، ہمیں اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ان کے سوا کوئی اور شخص رہبر نہ بن جائے۔ کیونکہ ہمیں ان کے عظیم کردار اور اس اعتماد کا علم تھا جو امام خامنہ ای کو ان پر تھا۔ ہم جانتے تھے کہ امام خامنہ ای کو دو افراد پر غیر معمولی اعتماد حاصل تھا؛ ایک حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ خامنہ ای، اگرچہ ان کے پاس کوئی سرکاری ذمہ داری نہیں تھی، اور دوسرے جناب آقای حجازی۔

ان کی شخصیت کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے تھے، اس میں تمام امور کے حوالے سے ان کی انتظامی بصیرت اور جامع تشخیص نمایاں تھی، بالخصوص کم از کم ان معاملات کے بارے میں جو ایران سے باہر کے امور سے متعلق تھے۔ نیز اہلِ مزاحمت ان سے بے حد محبت کرتے تھے۔ دوسری جانب ہمیں معلوم تھا کہ وہ نہایت متواضع اور مخلص ہیں۔ یہاں تک کہ میں نے بعض علمی اور محترم شخصیات سے یہ بھی سنا تھا کہ ان کی شخصیت عرفانی اعتبار سے ممتاز ہے، اور وہ اس سلسلے میں مجھ سے بعض باتیں بھی بیان کرتے تھے۔

جب ہم ان لوگوں کے ذریعے، جو ان کے ساتھ رابطے میں ہیں، امور کو سمجھنے اور ان کے بارے میں رائے قائم کرنے کے حوالے سے ان کے نقطۂ نظر سے آگاہ ہوتے ہیں، تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ رہبرِ شہید کے افکار سے بہت قریب ہیں، اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکری اعتبار سے وہ رہبرِ شہید کے سب سے قریب ترین فرد ہیں۔

خط: مزاحمتی محاذ کے برادران کے ساتھ ان کے روابط اور ان کی جانب سے حاصل ہونے والی شناسائی کے بارے میں ہمارے لیے بیان فرمایئے۔

شہید سید حسن نصر اللہ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے ساتھ مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ اسی طرح ایک اور برادر، جناب سید ہاشم الحیدری، بھی ان کے ساتھ بہت گہرا رابطہ رکھتے تھے اور ان کی شخصیت سے بخوبی واقف ہیں۔

خط: آپ نے فرمایا کہ آپ نے ان کی علمی مباحث دیکھی ہیں، تو آپ ان کے علمی مباحث کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

میرے نزدیک ان کا علمی مقام بڑے اور معروف مجتہدین سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ یعنی ان میں دینی مرجعیت کی ذمہ داری

سنبھالنے کی مطلوبہ اہلیت بھی موجود ہے۔ فقہ، اصول، علمِ رجال اور تفسیر میں ان کی علمی قدرت اور ان مباحث پر ان کی گہری دسترس بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ وہ ایک جلیل القدر فقیہ اور محقق ہیں اور علمی مباحث ہی میں پروان چڑھے ہیں۔ مزید برآں، فقاہت کے بنیادی پہلو کے ساتھ ساتھ اسلام اور حقائقِ زمانہ کی معرفت کے حوالے سے بھی ان کا ایک جامع نقطۂ نظر ہے، جو ان کی فقاہت کو ایک اور امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔

اسی طرح ایک برادر نے مجھ سے نقل کیا کہ جن دو حضرات نے انہیں منصبِ رہبری کے لیے تجویز کیا تھا، ان میں حضرت آیت اللہ العظمیٰ مکارم شیرازی اور حضرت آیت اللہ العظمیٰ سبحانی شامل تھے، اور ظاہر ہے کہ وہ حضرات ان کے علمی مقام سے بخوبی واقف تھے۔

خط: واپسِ کویت اور مزاحمتی محاذ کے دیگر ممالک میں شیعیانِ اہلِ بیت کا اس انتخاب کے بارے میں کیا ردِّعمل تھا، اگر آپ اس سے باخبر ہوں؟

ہم اس معاملے کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ اولاً حضرت آقا کی شہادت کے بعد عالمِ تشیع میں سب لوگ، چند ایک افراد کے سوا، ولایت کے پرچم تلے جمع ہوگئے۔ حتیٰ کہ پاکستان جیسے ملک میں بھی نوے فیصد پاکستانی عوام، خواہ شیعہ ہوں یا سنی، ولایت کے پرچم تلے آگئے۔ ثانیاً، حضرت سید مجتبیٰ کا انتخاب ہمیں امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد حضرت رہبر کے انتخاب کی یاد دلاتا ہے۔ اس انتخاب کی خبر سنتے ہی امیدیں دوبارہ زندہ ہوگئیں اور سب نے ایرانیوں کی طرح کہا: « خامنہ ای جوان ہوگئے! » یعنی امام خامنہ ای رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی تحریک کا تسلسل برقرار ہے۔

آج سب لوگ محبت کے ساتھ سید مجتبیٰ خامنہ ای کے پرچم تلے ہیں اور ان کے ساتھ بیعت کر چکے ہیں۔ صورتِ حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج شیعیانِ عالم کے درمیان ولایت اور ان کی اطاعت و فرمان پذیری، اپنی وسعت کے اعتبار سے، امام خامنہ ای اور امام خمینی کے اپنے زمانۂ قیادت کے مقابلے میں بھی زیادہ ہے۔ شیعہ عوام کا ان کے ساتھ تعلق ماضی کے ہر دور سے زیادہ مضبوط ہے، بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عراقی برادران کو دیکھیے! جب ہم اس معاملے کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جس طرح امام خامنہ ای کی شہادت کے بعد ایران، امام خامنہ ای کی شہادت سے پہلے کے ایران سے بالکل مختلف ہوگیا ہے، اسی طرح عراق کے شیعیان بھی بالکل اسی کیفیت سے گزر رہے ہیں۔ حالانکہ ہمیں عراق سے ایسی توقع نہیں تھی۔ آج ایران اور عراق گویا ایک ہی ملت بن گئے ہیں۔

پاکستان کے ایک برادر حجت الاسلام راجہ ناصر نے مجھے بتایا کہ ہم پاکستانی شیعیان آپس میں اختلاف رکھتے تھے اور متحد نہیں تھے، لیکن جس چیز نے ہمیں باہم متحد کیا، وہ امام خامنہ ای کی شہادت تھی؛ اور اب ہم سب آقا مجتبیٰ کے پرچم تلے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے: آج پاکستان کے نوے فیصد لوگ آقا مجتبیٰ کے پرچم تلے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض ایسے مشائخ بھی، جو وہابی علماء میں شمار ہوتے ہیں، آتے ہیں اور علانیہ ان کے ساتھ بیعت کا اعلان کرتے ہیں!

خط: آپ نے دنیا کی جو صورتِ حال بیان کی ہے، اسے مدِنظر رکھتے ہوئے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اسلامی بیداری کے ایک نئے مرحلے سے دوچار ہیں؟ آپ کے خیال میں اس صورتِ حال میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟

اسلامی انقلاب کے تین مراحل تھے: پہلا مرحلہ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں خالص محمدی اسلام کی بنیاد پر ایک فکری نظریے کی تشکیل کا تھا۔ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فکر کی بنیاد رکھی اور اپنی الٰہی وصیت میں دوسروں کو اس کی جزئیات اور تفصیلات کے بارے میں گفتگو اور غور و فکر کی دعوت دی۔

دوسرا مرحلہ ان مفاہیم کے استحکام اور ان کی ترویج کا تھا، جو امام خامنہ ای کے ذریعے انجام پایا۔ امام خامنہ ای امام خمینی کے افکار کی تشریح اور تبیین کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے دور میں مزید نئے محاذ اور مراکز بھی وجود میں آئے؛ جن میں مزاحمتی محاذ بھی شامل ہے، جو امام خمینیؒ کے دور میں موجود نہیں تھا اور امام خامنہ ای کے ذریعے قائم ہوا۔ ایک مرتبہ شہید سید حسن نصر اللہ فرمایا کہ اگر امام خامنہ ای کی تدبیریں نہ ہوتیں تو ہم ان میں سے کسی بھی فتح تک نہ پہنچ پاتے۔ اس مرحلے میں امام خامنہ ای اصیل اسلامی تمدن کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے، جو امام خمینیؒ کے زمانے میں موجود نہیں تھا۔ انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی مسلط کردہ جنگ شروع ہوئی اور اگرچہ اس جنگ میں ایسے افراد تربیت پائے جو انقلاب کا پرچم اٹھانے والے بنے، لیکن اس کے باوجود اس وقت یہ تمدنی منصوبہ موجود نہیں تھا؛ امام خامنہ ای اس کی بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ امام خامنہ ای کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسان، معاشرے، تاریخ اور حقیقت کے بارے میں ایک جامع اور ہمہ گیر نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

تیسرا مرحلہ ملتوں کی تڑپ اور بیدار ہونے کا مرحلہ ہے؛ اور یہ صرف اسلامی ملتوں تک محدود نہیں، بلکہ دنیا کی تمام آزاد قوموں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سے پہلے حق کا محاذ اس حد تک معروف نہیں تھا اور داعش جیسے مختلف گروہ بھی حق کی پیروی کا دعویٰ کرتے تھے۔ لیکن آج کفر، ظلم، امریکہ اور اسرائیل کے مقابل کھڑا ہونے والا واحد محاذ یہی محاذ ہے۔ آج « جو کوئی ہلاک ہو وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو، اور جو زندہ رہے وہ بھی روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ »[1] آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ گویا ملتیں بدل گئی ہیں اور اسلامی جمہوریہ کے بارے میں ان کی آگاہی اور دلچسپی کی سطح بڑھ گئی ہے۔ یہ تبدیلی اس حد تک ہے کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام خامنہ ای کی شہادت کے بعد ظلم کے مقابلے کے لیے ملتوں کی آمادگی ایسی سطح تک پہنچ چکی ہے کہ انسانی معاشرے کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال تلاش کرنا ممکن نہیں۔

خدا شیخ محمد مہدی آصفی پر رحمت فرمائے۔ وہ فرمایا کرتے تھے: ہمیں ظہور کی علامات کے بارے میں اتنی گفتگو کرنے کے بجائے، اسبابِ ظہور کے بارے میں زیادہ بات کرنی چاہیے۔ آج ہم اسبابِ ظہور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، جن میں سب سے اہم ملتوں کی آگاہی اور ان کی تحریک ہے۔ کس نے تصور کیا تھا کہ امریکہ میں نو ملین افراد مظاہرہ کریں گے؟ ہاں، یہ مظاہرے امریکہ کے آج ہی زوال کا سبب نہیں بنیں گے، لیکن وہاں کے حاکم نظام کے وجود کو کمزور ضرور کریں گے۔ اسی طرح یورپ میں ہونے والے مظاہروں کے بھی یہی اثرات ہیں۔ یہ سب انسانی معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلی کی نشانیاں ہیں۔ آج انسانی معاشرے میں تبدیلی ایک سنجیدہ حقیقت بن چکی ہے، اور ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنی تبلیغی صلاحیتوں اور فکری استعداد کو انسانی دنیا میں موجود حقائق اور امکانات کے مطابق ترقی دیں۔ ایسی دنیا جو اپنے نئے دور کے ابتدائی اور آسان ترین مراحل ہی میں ہمیں اسرائیل کے زوال کی نوید دے رہی ہے۔

> « حضرت آقا کی شہادت کے بعد، چند افراد کے سوا، عالم تشیع میں سب ولایت کے پرچم تلے آگئے۔ »

---

(۱) تاکہ جو ہلاک ہو وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو، اور جو زندہ رہے وہ بھی روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے۔ » (سورۂ مبارکہ انفال، آیت ۴۲)

خامنہ ای جوان ہو گئے

محمد صالحی

مضمون



یوں محسوس ہوتا ہے کہ الٰہی معجزات کو مجموعی طور پر دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ ہیں جن کی صورت زیادہ ظاہری ہوتی ہے؛ وہ معجزات جو انبیا لے کر آئے تاکہ ان کے ذریعے ایک طرح سے تحدی کی جا سکے کہ اگر کوئی ان جیسا کام کر سکتا ہے تو سامنے لائے۔ ایسے معجزات جنہیں دیکھ کر انسان کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ مثلاً سمندر کا شق ہو جانا، یا ابابیل کا بھیجا جانا، یا حضرت نوحؑ کی کشتی، جس کے ذریعے اہلِ ہدایت کو نجات دی گئی۔ اور دوسری قسم کے معجزات وہ ہیں جن کی صورت زیادہ باطنی ہوتی ہے اور اتنی ظاہری نہیں ہوتی۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ مثلاً عصا اژدہا بن جائے یا پہاڑ کے اندر سے اونٹنی نکل آئے؛ لیکن وہ پھر بھی معجزہ ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان کی صورت زیادہ باطنی ہوتی ہے، اس لیے گویا وہ زیادہ ایمانی ہوتے ہیں۔ زیادہ ایمانی اس لیے کہ وہ غیب پر ایمان کی منطق سے زیادہ ہم آہنگ ہوتے ہیں؛ اور چونکہ زیادہ ایمانی ہوتے ہیں، اس لیے خدا کو بھی زیادہ محبوب ہوتے ہیں!

افطار کے بعد بات نکلی کہ شبِ قدر میں قرآن سر پر رکھنے کی رسم کہاں ادا کریں۔ مادرِ فاطمہ کا دل جمکران میں لگا ہوا تھا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ مسجد میں تو یقیناً جگہ نہیں ہوگی اور صحن بھی سرد ہوگا۔ مجموعی طور پر میری رائے سڑک کے حق میں تھی۔ میں یہی کہتا ہوں کہ ان راتوں میں ہماری جگہ سڑکوں پر ہے۔ طے ہوا کہ میدانِ مفید جائیں گے۔ ہم اسی طرح بیٹھے ہوئے تھے اور مقرر کی گفتگو سن رہے تھے کہ ایک شخص اسٹیج پر گیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ مقرر بھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے نعرہ لگایا: اللہ اکبر، خامنہ ای جوان ہو گئے! پھر میزبان نے بھی مائیک سنبھال لیا اور تکبیر اور نعرے لگانے شروع کر دیے۔ لوگ بھی اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے اور پورے وجود کے ساتھ نعرے لگا رہے تھے۔ مجھے یہ بات بڑی دلچسپ لگی کہ اچانک مجمع کے اگلے حصے میں دو افراد نے آقا مجتبیٰ کی تصویر بلند کر دی۔ میں نے مادرِ فاطمہ کی طرف رخ کیا اور تصویروں کی طرف اشارہ کیا، گویا کہہ رہا ہوں: آخر یہ لوگ آقا مجتبیٰ کی تصویر کہاں سے لے آئے؟ لیکن معجزہ کہاں رونما ہوا؟ شاید ہم میں سے سب سے زیادہ خوش بین شخص نے بھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ اگر امامِ مسلمین، وہ بھی جنگ کے عین بیچ، شہید ہو جائیں تو اقتدار کی منتقلی اس قدر آسانی سے انجام پا سکتی ہے۔ لیکن اب یہ سب سے آسان،

بہترین اور معنوی ترین انداز میں، وہ بھی شبِ قدر میں، دشمنوں کی خواری اور دوستوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے ساتھ انجام پایا؛ حالاں کہ ابتدائی دنوں میں اسی کے باعث ہمارا دم نکلنے کے قریب تھا۔ لیکن خدا نے ہمارے اور ملت کے خبرگان کے دلوں پہ سکینہ اور اطمینان نازل فرمایا۔ یہ مومنین کے دلوں پہ سکینہ واطمینان کی نوعیت کے معجزات تھے۔ بالکل جنگِ بدر میں الٰہی معجزات اور نصرتوں کی مانند؛ ایسے معجزات جن کے بارے میں فرمایا گیا: «أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ»[1] یعنی میں نے تین ہزار فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کی، اور یہ کہ اگر تم صبر کرو تو اس تعداد کو پانچ ہزار تک پہنچادوں گا: «بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ»[2] ۔ میں فون اٹھاتا ہوں اور خبریں دیکھتا ہوں۔ ہاں، خبر سرکاری ہے۔ گروپوں میں بھی سب نے لکھنا شروع کردیا ہے اور ہر شخص کچھ نہ کچھ کہہ رہا ہے۔ بہت سے لوگ مسلسل روتے ہوئے ایموجی بھیج رہے ہیں۔ سید، جو ہمیشہ ہر چیز کو مذاق میں لیتے ہیں، نے لکھا ہے: «یا امام زمان» اور اس کے بعد بھی رونے والا ایموجی۔ مجھے واقعی محسوس ہوتا ہے کہ دور رہے ہیں۔ کسی نے لکھا: «آقا مجتبیٰ! خدا آپ کے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟!» ایک اور نے لکھا تھا: «آقا مجتبیٰ! ہم آپ کے والد کے یتیم بچے ہیں ہم پر اعتماد کیجیے۔» میرے خیال میں بہترین نعرہ وہی ہے۔ وہی روایتی نعرہ جو ہر جگہ لگایا جارہا ہے۔ وہی مجھے سب سے زیادہ دل میں اترتا ہے۔ سادہ بھی ہے اور گہرا بھی۔ گویا اسی ایک جملے نے ساری بات کہہ دی ہو؛ معجزے کی مانند ہے۔ خامنہ ای جوان ہوگئے.....

عذابِ ھُون

استاد سید مجتبیٰ خامنہ ای کے درسِ تفسیر سے ایک اقتباس

﴿الیوم تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنتُمْ تَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنتُمْ عن ایاتِهِ تَسْتَكْبِرُونَ﴾ (انعام: ۹۳)

"آج، جب برزخ کی دنیا میں داخل ہونے کا دن ہے، تمہیں ذلت و خواری دینے والے عذاب سے اس بات کی پاداش میں سزا دی جائے گی کہ تم اللہ کے بارے میں ناحق باتیں کہتے تھے اور اس کی آیات و نشانیوں کو قبول کرنے اور ان کے سامنے تسلیم ہونے سے تکبر کرتے تھے۔"

«عذابِ ھُون» قیامت کے سخت عذابوں میں سے ایک ہے، جس سے مراد انسان کی خواری، ذلت اور تحقیر ہے۔ قرآن کی آیات کی روشنی میں اس عذاب کی دو بنیادی جڑیں اور دو اہم اسباب ہیں: ۱۔ استکبار: دنیا میں تکبر کرنا اور خود کو بڑا سمجھنا۔ ۲۔ فسق: نافرمانی، گناہ اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے دائرے سے باہر نکل جانا۔

عذابِ خواری کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف جہنم کی آگ تک محدود نہیں، بلکہ میدانِ محشر اور حساب و کتاب کے مرحلے ہی سے اس کا آغاز ہوجاتا ہے۔ بطور نمونہ در روایات آمدہ است کہ متکبر افراد قیامت کے دن چیونٹیوں کی صورت میں محشور کیے جائیں گے، تاکہ دوسروں کے قدموں تلے روندے جائیں اور دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہی انتہائی خواری اور ذلت کا سامنا کریں۔

---

(۱) سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۲۴

(۲) ایضاً، آیت ۱۲۵



جائزہ

اس شمارے میں حضرت آیت اللہ سید مجتبیٰ حسینی خامنہ ای کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ

۱. روحانی و سلوکی پہلو

- ایک مجاہد خاندان میں پرورش پانا اور اس کے نشیب و فراز اور مشکلات کا تجربہ کرنا (حقانی)
- دفاعِ مقدس کے محاذوں کی اگلی صفوں میں موجودگی (حقانی)
- اہلِ معنا اور صاحبانِ نفوسِ قدسیہ سے مسلسل روحانی تعلق؛ آیت اللہ بہاء الدینی، کشمیری اور بہجت جیسے بزرگوں سے استفادہ (حقانی، بہجت، سعیدیان، حداد عادل)
- امامِ شہید کے ساتھ معنوی اور قلبی تعلق (حقانی)
- تلاوتِ قرآن سے انس اور اس پر مداومت (حداد عادل)
- نوافل میں قرآنِ کریم ختم کرنے کا معمول (حقانی)
- بیت المال کے بارے میں ساٹھ کی دہائی ہی سے غیر معمولی احتیاط اور احساسِ ذمہ داری! (حقانی، حداد عادل)
- سادہ طرزِ زندگی
- حضراتِ معصومینؑ کی زیارت سے بے پناہ شغف اور حضرت معصومہؑ کی روزانہ زیارت کی پابندی

۲. سیاسی و سماجی پہلو

- سیاست کے میدان میں قدم رکھنے سے قبل آیت اللہ العظمیٰ بہجت سے اجازت حاصل کرنا (بہجت)
- امامِ شہید کے ۲۵ سال تک فوجی اور سلامتی کے امور میں معاونِ خصوصی کے طور پر خدمات انجام دینا (حداد عادل)
- محورِ مقاومت کے رہنماؤں اور کمانڈروں سے براہِ راست رابطہ اور مسلسل ملاقاتیں (حقانی)
- ملک کے بعض تمدنی منصوبوں کی پیروی اور نگرانی (حاج ابوالقاسم)
- امامِ شہید کی جانب سے جدید شہری منصوبہ بندی، توانائی، خوراک وادویات اور آبادی جیسے شعبوں میں ذمہ داریاں سونپی جانا (کمالی)
- ٹیکنالوجی کے ماہرین، علمی نخبگان اور علم پر مبنی اداروں سے رابطہ
- امامِ شہید کے حکم پر «ثقافت» کے موضوع پر تفصیلی مطالعات
- بعض خصوصی اور خفیہ دفاعی و عسکری منصوبوں کی پیروی اور نگرانی

▣ حوزۂ علمیہ قم میں متعین اہداف کے تحت علمی و تحقیقی اداروں کا قیام (حاج ابوالقاسم)

▣ محرومین کی وسیع پیمانے پر امداد کے لیے ایک منظم تشکیلاتی نظام قائم کرنا (اکبری)

۳۔ علمی پہلو

[علمی شخصیت]

▣ اسلامی علوم میں جامعیت اور ہمہ گیر دسترس

▣ قم اور نجف کے فقہی و اصولی مکاتب سے علمی ارتباط (صمدی)

▣ مختلف علمی شعبوں میں وسیع اور کثیر مطالعات (حقانی، حداد عادل، سعیدیان)

▣ مباحث کی پیشکش میں فکری انسجام اور ان کے لازمی تقاضوں پر توجہ

▣ علمی حریت اور آزادانہ طرزِ فکر (صمدی)

▣ تدریس کے اسلوب میں شاگردوں کی علمی تربیت پر خصوصی توجہ؛ مثلاً درس کو تحقیق پر مبنی بنانا (قاسمی، اکبری)

[علمی رجحانات]

▣ توحید اور اسلامی علوم کے باہمی ربط و یکپارچگی پر توجہ، اور انہیں ایک دوسرے سے مربوط جامع نظام کے طور پر دیکھنا (علی آبادی، صمدی)

▣ فقہ کو تمدنی زاویۂ نگاہ سے دیکھنا (حاج ابوالقاسم)

▣ فقاہت میں تاریخی نقطۂ نظر اختیار کرنا (علی آبادی)

▣ اصولی مباحث میں قرآنی اور کلامی مبانی کی توسیع اور ان کے تسلسل پر توجہ (علی آبادی، صمدی)

▣ اصولی و فقہی مباحث میں عرفی مولا کے ساتھ حقیقی مولا کو بھی پیشِ نظر رکھنا (علی آبادی)

▣ علمِ اصول کا فقہ سے نشوونما پانا اور اصولی مسائل کو تفقہ کے دائرے میں آگے بڑھانا (علی آبادی)

▣ امام محمد باقرؑ سے امام حسن عسکریؑ تک ڈیڑھ سو سالہ انسانی سیرت و طرزِ عمل سے ایک فقہی نظامِ ارتباط اخذ کرنا (صمدی)

▣ فقاہت کو وسعت دینا اور فقہ کو جوارحی اور جوانحی فقہ میں تقسیم کرنا (صمدی)

▣ ارتکاز کو اہم ترین فقہی دلیل کے طور پر پیشِ نظر رکھنا (صمدی)

▣ مباحث کی تاریخی جڑوں اور پس منظر پر توجہ دینا

۴۔ بعض ذاتی اوصاف

▣ عوام سے گھل مل کر رہنا، مختلف ذوق و رجحان رکھنے والی شخصیات پر توجہ دینا اور ان سے رابطہ رکھنا

▣ ایرانی اور اسلامی ثقافت پر خصوصی توجہ

▣ اسراف سے سخت اجتناب

▣ استکبار ستیزی

▣ پاک دستی اور مالی معاملات میں دیانت داری

▣ خاندان اور اہلِ خانہ کے احترام اور ان کی خواہشات کا خیال رکھنا

▣ بچوں اور گھر کے افراد کے ساتھ بے تکلفی اور نرمی، اور سختی سے گریز

▣ والدہ سے خصوصی محبت اور ان کی خاص نگہداشت

▣ بچوں کے ساتھ فوری اور بے تکلف رابطہ قائم کر لینا

▣ سادہ طرزِ زندگی میں امامِ شہید کی سادگی سے مشابہت

▣ دوسروں کے لیے الفاظ اور تعبیرات کے انتخاب میں خاص دقت و احتیاط

▣ جدید علوم اور نئے فنون پر مکمل دسترس

▣ فلم و ھنر میں دلچسپی

▣ کام اور تعلیم میں نظم و ضبط

▣ مصری قرا کی تلاوت سننے سے خاص شغف



The Leader of Ummah Convention 2026

CamScanner